پندرہ روزہ
قافلہ
لاہور

مُردہ بھٹو
زندہ بھُٹو

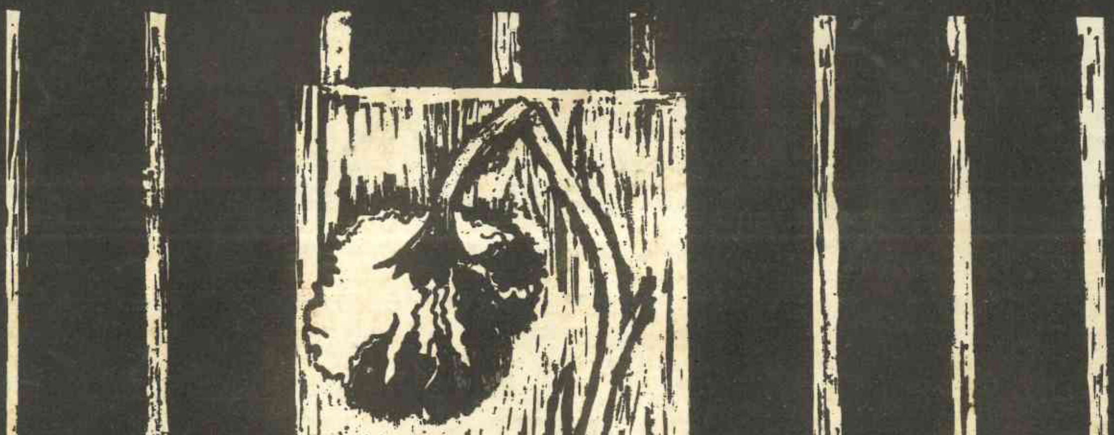

۴/-

اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر پر

اُردو بُک ڈائجسٹ

کا یادگار ـــ اور ـــ دستاویزی نمبر

کرشن چندر نمبر

کرشن چندر کی لازوال کہانیاں۔ فن اور شخصیت پر مضامین اور خاکے، تنقیدی جائزے اور ہر اہم تحریر جو کرشن چندر پر لکھی گئی، اس خاص نمبر میں شامل ہے۔

صفحات ۲۶۰ ★ قیمت: دس روپے ★ تاریخ اشاعت: ۱۵ر مئی

شاہکار رومان سیریز کے سلسلۂ انجلیق کی دوسری کتاب

چھوٹے نواب

شادی کے دن انجلیق کے اغوا اور چھوٹے نواب کے محل میں بیتنے والے لمحوں کی ڈرامائی داستان

اُردو میں اپنی طرز کی واحد
اور مسلسل طویل ترین داستان

تصنیف: ستار طاہر ★ قیمت: چار روپے

تاریخ اشاعت: ـــ یکم جون

یکے از مطبوعاتِ مکتبہ شاہکار
پندرہ روزہ
قافلہ
لاہور

شمارہ نمبر ۹ | ۱۵ر مئی ۱۹۷۹ء

مُدیرِ مسئول
سید قاسم محمود
مُدیر
ستار طاہر
(سرورق: انور سجاد)

اس شمارے میں ایک مکمل کتاب

مُردہ بھٹو زندہ بھٹو

تصنیف: ستّار طاہر

جنرل ضیا بھٹو کی قبر پر فاتحہ خوانی کریں

بھٹو مرحوم کی شخصیت و کردار پر غالباً بہترین تبصرہ جنرل محمد ضیاالحق نے کیا ہے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کی حکومت کو معزول کرنے کے چند روز بعد فرمایا تھا: "بھٹو صاحب نے بہت سے اچھے کام بھی کئے ہیں اور بہت غلط کام بھی کئے ہیں۔" گزشتہ ماہ بھی انہوں نے ایک غیر ملکی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا: "انہوں نے ملک کو بہت بنایا بھی اور تباہ بھی بہت کیا۔"

یہ ایک انسان کے بارے میں ایک انسان کی رائے ہے اور دیانت اور باضمیری سے دی گئی ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی رائے بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اُن کی رائے کو حکومت کے تمام اقدامات میں بہرحال نظر آنا چاہئیے۔ لیکن بھٹو صاحب کے سلسلے میں عمّالِ حکومت نے ابتدا ہی سے جس بدنیتی سے سی ایم ایل اے کی رائے کو نظر انداز کیا وہ قابلِ مواخذہ ہے۔

ہونا یہ چاہئیے تھا کہ کم از کم سرکاری ذرائع ابلاغ سربراہِ حکومت کی رائے کے مطابق بھٹو مرحوم کی خوبیوں اور خدمات کی بھی تشہیر کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی غلطیاں بھی سامنے لاتے۔ لیکن ان دو برسوں میں ہُوا یہ ہے کہ اُن کی فقط غلطیوں اور غلط کاریوں کی زبردست تشہیر کی گئی ہے۔ کروڑوں روپے کے اخراجات متعدد قرطاسِ ابیض کی تیاری اور اشاعت پر صرف ہوئے ہیں۔ سرکاری نیوز ایجنسی، نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات، دیگر ہم نوا اخبارات و جرائد کے ذریعے بھی بھٹو کی بدیوں کو بھی اُچھالنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا، اور اُن کی خدمات اور خوبیوں کے محض "تذکرے" کو بھی گناہِ کبیرہ خیال کیا گیا۔

افسرانِ حکومت کے اس روّیے سے سخت قومی نقصان ہوا ہے اور معاشرے کی نفسیات پر ایسا بُرا اثر پڑا ہے کہ برسوں تک اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اب ایک طرف وہ شقی القلب صحافی ہیں جو بھٹو صاحب کو شیطان ابنِ شیطان کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اُن کے واقعۂ مرگ کو بھی چٹخارے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہ کس طرح سٹریچر پر لٹایا گیا، کس طرح رسّی باندھی گئی، کس طرح فلاں اعضا نے پہلے دم توڑا اور کونسی ہڈی اور کونسے عضلات میں سے خون بعد میں خشک ہوا۔ دوسری طرف وہ کوتاہ اندیش ہیں جو بھٹو کو فرشتہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور اُن کی غلطیوں کو بھی صحیح بنا کر دکھاتے ہیں۔

ایسا نہ تو انسانوں کی زندگی میں ممکن ہے اور نہ یہ کسی لحاظ سے ہماری قوم کے حق میں مفید ہی ہے۔ جنرل صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس یک طرفگی اور جانب داری کے مرتکب افسروں کے خلاف سخت کارروائی کا حکم کرتے ہوئے آئندہ کے لیے ہدایات جاری کریں کہ بہت ہو لیا۔ تصویر کا ایک رُخ دیکھتے دیکھتے پبلک اُکتا گئی ہے۔ اب بھٹو صاحب کی خوبیوں، اچھائیوں اور خدمات کو بھی سرکاری طور پر اُجاگر کیا جائے، کیونکہ جنرل صاحب کی رائے یہی ہے جس کا وہ بار بار اظہار کر چکے ہیں۔

جنرل صاحب کو اچھے جذبات پیدا کرنے میں خود بھی پیش قدمی کرنی چاہئیے۔ فرض پر ذاتی دوستی اور محبت کی قربانی دینے اور قانون کی بالادستی ثابت کرنے کی اُن کی ذہنی کشمکش، ہمارے خیال میں، چار اپریل کو ختم ہو چکی ہے۔ بھٹو صاحب بہرحال زندگی میں اُن کے مہربان اور شفیق دوست رہے ہیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے تو اپنے تمدنی و ثقافتی مزاج کے مطابق جنرل صاحب کو اُن کی غلطیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دینا چاہئیے۔ ہمارا معاشرتی چلن تو یہ ہے کہ ہم مرنے والے کی خامیوں کو بھول جاتے ہیں اور خوبیوں کو یاد رکھتے اور یاد کرتے ہیں۔

جس قبر پر پھول نچھاور ہوتے ہوں اور قرآن خوانی ہوتی ہو، وہاں پہرہ زیب نہیں دیتا۔ چہلم قریب آ رہا ہے۔ ہمارے خیال میں جنرل صاحب کو چاہئیے کہ نہ صرف عوام کو خاک کے اس خاموش، بے ضرر تودے پر جانے کی عام اجازت دیں، بلکہ خود بھی ازراہِ انسان نوازی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کریں اور ہو سکے تو ازراہِ دوستی پھولوں کی چادر بھی چڑھائیں۔ اُن کے اس اقدام سے پیچیدہ قومی نفسیات میں سُلجھاؤ اور فلاح کے کئی پہلو پیدا ہوں گے، ہمیں یقین ہے۔

سیّد قاسم محمود

"بھٹو کے لئے فاتحہ خوانی" سے "مُردہ بھٹو زندہ بھٹو" پر مشتمل اس کتاب کے مصنف کی حیثیت سے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں، یہ کتاب ایک اہم اور دلدوز قومی سانحے کے ردّ عمل میں لکھی گئی ہے۔ اس سانحے کا تجزیہ ادب، انسانی تاریخ، انسانی احساسات اور معروضی سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔ جس سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے اور آزادیٔ اظہار میں اختلاف کا حق آپ کا وہ بنیادی حق ہے۔ جس کے لیے اس کتاب کا مصنف آپ کے ساتھ ہے۔ اس کتاب کا مقصد صورتِ حال کی اصلاح کے ساتھ مذہبی سماجی اور اخلاقی اقدار کی سربلندی ہے۔ کسی مستقل ادارے کا رتبہ یا درجہ کم کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ مستقل اداروں کی تکریم ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔

ستار طاہر

خط و کتابت: پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور
ترسیلِ زر: کلفٹن کالونی۔ لاہور
ٹیلیفون: ۸۵۴۱۰۳
تار: "شاہکار"
ششماہی: ۴۵/- سالانہ: ۸۵/-
فی کاپی: چار روپے

سیّد قاسم محمود ناشر نے باہتمام سید ریاض حسین الجدہ پرنٹرز، اُردو بازار لاہور سے طبع کرا کر مکتبہ شاہکار، کلفٹن کالونی، لاہور سے شائع کیا۔

آئندہ شمارہ
"چہلم نمبر" ہوگا
(چار روپے)

بھٹو کے لیے فاتحہ خوانی

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام کائنات کا ربّ ہے۔ رحمان اور رحیم ہے روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ پس سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

(القرآن الحکیم ، سورۃ الفاتحہ ؛ ترجمہ سید مودودی)

کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد، اور اس کا ہم سر نہیں ہے۔

(القرآن الحکیم ؛ سورۃ اخلاص ؛ ترجمہ سید مودودی)

اے خدا اپنی شفقت کے مطابق مجھ پر رحم کر اپنی رحمت کی کثرت کے مطابق میری خطائیں مٹا دے (زبور)

" اور جو مر گئے ہیں انہیں بُرا نہ کہو (القرآن الحکیم)

IN THE FORMER TIME WE WERE MOVED TO DO EVIL, FORSAKING THEE, BUT THOU, THE ONE, THE GOOD GOD, DIDST NEVER CEASE DOING GOOD.. (ST. AUGUSTINE)

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی،
ہم جنہیں رسمِ دُعا یاد نہیں۔

تو علیم و خبیر ہے۔ تو رحیم و رحمان ہے اور تُو ہی دونوں جہانوں کا مالک ہے۔ یہ تُو ہے، جس نے ہم کو زندگی سے نوازا اور زندگی کی نعمتوں کی بارش ہم پر کر دی۔ ہماری زندگی ہر ہر سانس تیرے حکم کی پابند ہے۔ ہم تیری مخلوق ہیں۔ تیرے بندے ہیں اور تو ہمارا خالق، ہمارا آقا اور ہمارا ربّ ہے۔

ہم خطاکار ہیں۔ ہم سرکش ہیں۔ ہم گنہگار ہیں۔

لیکن یہ خطاکار و گنہگار بھی تیری ہی رحمت کے طلبگار ہیں اور تجھی سے رحمت اور فضل کی بھیک مانگتے ہیں۔ تو جو رحمان اور رحیم ہے۔ قادرِ مطلق ہے۔

تو زندگی اور موت کو دینے والا ہے۔ سب کچھ تیرے بس میں ہے اور تیرے فیصلے سے بڑا اور سچا فیصلہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ تو جزا اور سزا کا مالک ہے۔ ہم فانی ہیں۔ ہم تیری طرف سے آئے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ جانا ہے اور تجھی سے ہم بخشش کی اُمید کے طلبگار ہیں۔

تُو نے ہمارے لیے اپنے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا۔ دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر۔ ہماری ہدایت کے لیے۔ ہماری اصلاح کے لیے۔

ہم اپنی خطاؤں کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف ——— !

اے ربِّ دو جہاں۔ تو ہماری پناہ گاہ ہے۔ تجھ میں ہی ہماری نجات ہے اور تجھ سے ہی ہم دُعا کرتے ہیں کہ تو ہی عبادت اور دُعا کا سزاوار ہے۔ سب حمد و تمجید صرف تیرے لیے ہے۔

یہ بندہ، جو دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ یہ بھی تیرا ہی بندہ تھا۔ تیری ہی مخلوق تھا۔ اس کی خطاؤں کو بخشنے والا تو ہی ہے۔ تو ہی انعام سے نوازتا ہے اور تو ہی سزا دیتا ہے اور ہم تیرے حقیر بندے اس بندے کے لیے تجھ سے مغفرت کی دُعا کرتے ہیں۔

(آمین)

معذرت

اپنے کسی بنیادی حق کا استعمال کرتے ہوئے اگر معذرت کا عنصر خیالات اور تحریر میں شامل ہو جائے تو یقین کیجئے کہ مسئلہ بہت نازک اور پیچیدہ بن جاتا ہے۔ یہ کتاب جسے آپ پڑھیں گے۔ ایک طرح سے ایک معذرت نامہ ہے اگر آپ زیادہ فراخ دلی سے کام لیں تو اسے ایک ایسے آدمی کا معذرت نامہ کہہ سکتے ہیں جو قدرے پڑھا لکھا ہے اور انسان ہے۔ پرانے فلسفوں نے انسان کی بے شمار تشریحات اور توضیحات پیش کی ہیں لیکن ایک ایسی بات ہے جس پر سب فلسفی متفق ہیں کہ انسان ایک ایسا نامیاتی وجود ہے جو سوچتا ہے۔

یہ کتاب اس لیے بھی ایک معذرت نامہ ہے کہ اس میں جن مسائل اور جن موضوعات کو چھوا گیا ہے اُن کے بارے میں انسانی اور احساساتی سطح پر کچھ ایسے اشارے تو شاید مل جائیں جن میں ان مسائل کی عقدہ کشائی کے امکانات تو موجود ہوں لیکن حل کوئی نہیں ملتا۔

یہ کتاب بھٹو کی پھانسی کے سانحے کے رّدِ عمل میں لکھی گئی ہے۔

اور یہیں سے نازک مسئلے اور پیچیدگیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ولیم بلیک نے کہا تھا ”میں جب کسی کے مرنے کی خبر سنتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اپنے وجود کا ایک حصہ مر گیا ہے“ ولیم بلیک نے جب یہ لکھا تھا تو اس کے سامنے کسی خاص شخص کی موت نہ تھی۔ جبکہ یہ بھی مانی ہوئی حقیقت ہے کہ بعض شخص بہت چاہے جاتے ہیں اور اُن کی موت کا دکھ عام آدمیوں کی موت کی نسبت بہت زیادہ شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔

کہا گیا کہ بھٹو کی موت کی خبر لوگوں نے بڑے سکون سے سنی۔

یہ کتاب اخبار کی اس سرخی کا ایک رّدِ عمل ہے۔ نامیاتی قوتیں اور انسان کبھی سکون کی حالت میں نہیں رہتا۔ یہ صرف ایک ”صحافی“ ہی دیکھ اور سوچ سکتا ہے کہ کوئی انسان پُر سکون ہے جبکہ زینو سے لے کے برگساں اور پھر اقبال تک۔ اور ارشمیدس سے لے کر آئن سٹائن تک کوئی فلسفی اور کوئی سائنس دان یہ تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کا ذہن پُر سکون ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ساکت اشیا میں بھی ایک عنصر حرکت کا ضرور پایا جاتا ہے اور فریب نظر میں بھی ”حرکت“ موجود ہوتی ہے۔

بے لچک اور مصلحت اندیش معاشروں میں ایسی ہی صحافت جنم لیتی ہے۔ دہشت خوف اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا انسان جب نہ روتے ہیں اور نہ چیختے ہیں تو دراصل وہ بہت بے چین اور بہت گہری سوچوں میں گم ہوتے ہیں۔

یہ اپنے اپنے رویوں کا فرق ہے۔ کہیں بہت عجلت سے کسی کی موت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

اور کہیں بہت آہستہ آہستہ رّدِ عمل کا اظہار ہوتا ہے۔

اور تاریخ کا پہیہ بہت آہستہ، نامعلوم اور غیر محسوس انداز میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی جامد یا کھڑا نہیں ہوتا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ —— یہ کتاب اس سلسلے میں بھی سوائے چند اشاروں اور کھلی معذرت کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون انسانی معاشروں میں نہ صرف یہ کہ واجبِ احترام سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات انسان کے سب سے بڑے بنیادی حق آزادیٔ تحریر کی راہ کی سب سے اُونچی دیوار بھی بن جاتا ہے۔

اس کتاب کا مقصد اُلجھی ہوئی سوچوں کو سلجھانا تو ہے لیکن کوئی حتمی فیصلہ دینا نہیں آج پوری دنیا کے لوگ فرانز فینن کے ”افتادگانِ خاک“ (The Wretched of The Earth) کے فلسفے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ نو آزاد افریقی اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کے لوگوں نے ’افتادگانِ خاک‘ کے فلسفے کو اپنے لہو میں رچا لیا۔ ظالم کے خلاف تشدد اور مزاحمت کا ہتھیار اُٹھایا اور اپنے اپنے ملکوں کو آزاد کر لیا۔ لیکن یہ کتاب اس فلسفے کی بھی پرچارک نہیں۔ یہ کتاب صرف ایک معذرت نامہ اور انسانی احساساتی سوچوں پر مشتمل ہے کیونکہ بے لچک اور آزادیٔ تحریر و تقریر سے محروم معاشروں میں بعض اوقات باضمیر لوگوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ محض معذرت پر اکتفا کر لیں۔

یہ کتاب اس نیک خواہش کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ شاید اور لوگ بھی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے اندر معذرت کے جذبے کو چھونے اور محسوس کرنے لگیں۔

قانون انسانی ذہن کی پیداوار ہے اس کی ہمہ گیر افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا احترام سب پر واجب ہے لیکن کیا قانون کا احترام آزاد معاشروں میں فرض بھی قرار دیا جا سکتا ہے؟ —— کیونکہ اگر قانون کے فیصلوں کے احترام کو انسانی معاشروں کے لیے فرض قرار دے دیا جائے تو پھر نچلی سطح سے لے کے انتہائی اونچی سطح کی عدالتوں کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کتاب کے لکھنے والے کی قانون سے ساتھ واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے لیکن وہ خدا کی الہامی کتابوں پر راسخ ایمان اور عقیدہ رکھتا ہے اور اسلام اس کا مذہب ہے اور وہ اسلام اور خدا کی آخری کتاب کے علاوہ باقی تمام قوانین کو ادھورا اور نامکمل سمجھتا ہے اور اس کتاب کے لکھنے والے نے ایسی کتابوں اور ایسے مصنفوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگیاں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی خامیوں اور کمزوریوں کو سامنے لانے میں گزار دیں۔ ان لوگوں نے اپنے عہد میں صعوبتیں بھی برداشت کیں اور قید و بند کی اذیتیں بھی سہیں۔ لیکن یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دراصل انصاف اور انسان کے بنیادی حقوق کی جنگ لڑی اور آج ہم جس دنیا کو مہذب اور متمدن کہتے ہیں۔ اس کی صورت گری انہی لوگوں کی مرہونِ منت ہے۔

وکٹر ہیوگو ساری عمر پھانسی کی سزا کے خلاف آواز اٹھاتا رہا۔ اُس نے انسانی جان کی قدر و قیمت کو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے واضح کیا اور دنیا ایسے کئی لوگوں کو عزت اور احترام سے تاریخ میں جگہ دے چکی ہے۔ جنہوں نے قانون کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے آواز اٹھائی۔

ہمارے ملک میں جو قانون رائج ہے وہ برطانیہ کی دین ہے۔ عہدِ غلامی کی یادگار ہے۔ اس قانون کا ڈھانچہ اور اس کا تعزیری نظام مجھ ایسے لوگوں کا موضوع نہیں ہے۔

لیکن ایک بات کیطرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بھٹو کو جس قانون کے تحت پھانسی پر لٹکایا گیا وہ اسلامی قانون نہ تھا۔ پاکستان میں جو تعزیری نظام رائج ہے وہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ برطانوی عہدِ غلامی میں اسے رائج کیا گیا اور اس میں کئی ترمیمیں بعد میں ہوتی رہی ہیں اور خود برطانیہ میں "میگنا کارٹا" کے بعد قانون میں جو تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ اپنی جگہ ایک علیحدہ بحث ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق انصاف۔ جزا اور سزا کا آخری فیصلہ کرنے والی خدائے لایزل کی ذات ہوتی ہے۔ لیکن قانون کا احترام کرنا اسلام نے سکھایا ہے لیکن کس قانون کا؟ غیر اسلامی قانون کا؟ یا اسلامی قانون کا؟ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض پاک و ہند کے نامور علماء اور رہنماؤں نے برطانوی عہد میں برطانوی قانون کو ماننے سے انکار کیا۔ تاہم اس کتاب کا منشا اور مقصد ایسا نہیں ہے۔ ہم قانون کے احترام کو ضروری سمجھتے ہوئے صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی قانون اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود نامکمل ہوتا ہے اور اس میں ہر دور میں تبدیلیاں کی گئی ہیں ......!

دنیا کے ہر ملک میں ایک عدالت کے فیصلے کو دوسری عدالت میں چیلنج کیا جاتا ہے۔ نچلی سطح کی عدالتوں کے فیصلوں کو اونچی سطح کی عدالتیں رد کر دیتی ہیں اُن کی توثیق کرتی ہیں۔ ملزموں کو بری کر دیتی ہیں۔ اُن کو پھانسی لگا دیتی ہیں اور ایسے فیصلوں اور ایسے نظائر کی تعداد لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مل سکتی ہے۔ ایک ہی قانون کی ایک ہی دفعہ کی قانونی تشریح اور اُس کے فیصلے کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے۔ پانچ جج متفقہ فیصلہ دیں۔

اور پھر اُسی فیصلے کے خلاف اپیل پر چار جج متفقہ فیصلہ لکھتے ہیں اور تین اختلافی۔ قانون کی ساری موشگافیاں نکتہ طرازیاں دقیقہ سنجیاں اپنی جگہ —— ذرا انسانی سطح پر سوچیے اور یہ کتاب اسی انسانی سطح کی سوچ کا نتیجہ ہے۔

چار واجب الاحترام جج ایک شخص کی موت کا فیصلہ لکھتے ہیں اور انہی کے ہم مرتبہ ہم نشین تین جج اُسے آزاد کرنے کا فیصلہ صادر فرماتے ہیں، قانون اپنے تقاضے پورے کرتا ہے کیونکہ اکثریتی فیصلے کو قانون میں برتری دی جاتی ہے لیکن ان قانونی باتوں کو چھوڑتے ہوئے انسانی سطح پر سوچیے —— داؤ پر کون ہے؟

ایک انسانی جان —— ایک انسان کی زندگی اور موت!

اور ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ صورتِ حال انسانی سطح پر بڑی مضحکہ خیز بن جاتی ہے اس کتاب میں صرف یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے تو ایک نازک اور پیچیدہ لمحہ آ جاتا ہے۔

قانون کے وہ ڈھانچے اور وہ سانچے، جو بن چکے ہیں جو رائج ہیں اُن کا احترام واجب برحق لیکن احساساتی سطح پر یہ سوچ اپنی جگہ —— کہ کیا سارے قانونی تقاضوں اور سارے قانونی احترام اور عدلیہ کی برتری کے باوجود ایک انتظامی سربراہ کو یہ حق دینا کتنے بڑے تضاد کو سامنے لاتا ہے کہ وہ بیک جنبشِ قلم قانون کے فیصلے کی تنسیخ بھی کر سکتا ہے اور اُس کی توثیق بھی۔

ملک کی سب سے بڑی اور اعلیٰ عدالت جس شخص کو مجرم قرار دیتے ہوئے پھانسی کی سزا سناتی ہے اس کی قسمت کا آخری فیصلہ عدالتیں نہیں، بلکہ انتظامیہ کا سربراہ کرتا ہے۔ کیونکہ انتظامیہ کا سربراہ اس اختیار اور ہتھیار سے لیس بھی کر دیا گیا ہے کہ وہ عدالت کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس کی توثیق بھی کر سکتا ہے اور تنسیخ بھی۔

اگر انتظامیہ کا سربراہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے فیصلے کی توثیق کر دے تو عدلیہ کی آزادی اور عدلیہ کی آزادی میں عدم مداخلت کا چرچا ہوتا ہے لیکن اگر ملک کی سب بڑی عدالتیں ایک شخص کو مجرم قرار دیتے ہوئے پھانسی کا مستحق ٹھہرائیں اور پھر انتظامیہ کا سربراہ اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے مجرم کی جاں بخشی کر دے تو عدلیہ کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں کہ وہ اپنے فیصلے پر پابندی کروا سکے۔ اس کے آگے قانون خاموش ہے۔

اور یہاں سے انسانی سوچ شروع ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس سوچ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وہ جس کا شوہر، جس کا باپ، جس کا بیٹا پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے، وہ لوگ وہ انسانی رشتے اپنے شوہر، باپ اور بیٹے کو پھانسی لگانے والے کو کبھی منصف نہیں مانتے۔ بھلے جسے پھانسی دی گئی ہو وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن آج تک کوئی ایسا قانون نہیں بنا —— جو پھانسی لگنے والے کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے جذبات پر پابندی لگا سکتا ہو۔

اور انسانی رشتے صرف خون کے رشتوں تک محدود نہیں ہوتے یہ اتھاہ بے کراں اور بے کنار ہوتے ہیں۔

تو پھر ساڑھے سات آٹھ کروڑ کی آبادی میں کیا ڈیڑھ کروڑ لوگ بھی ایسے نہ ہوں گے جو بھٹو کے ساتھ خون کا رشتہ نہ رکھنے کے باوجود گہرا قلبی اور انسانی رشتہ رکھتے ہوں! کیا ایک ڈیڑھ کروڑ انسانوں کا رشتہ دار جب دنیا سے اُٹھے تو اُس ملک کے لوگ سکون کی حالت میں نظر آ سکتے ہیں؟

یہ کتاب اس لیے بھی ایک معذرت نامہ ہے کہ وہ سب انفرادی اور اجتماعی سوچیں جنہوں نے بھٹو کی پھانسی کے ردِ عمل کی صورت میں جنم لیا اُن سب کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ کتاب شاید اس وجہ سے بھی ایک معذرت نامے کی صورت اختیار کر گئی ہے کہ اس ملک میں شاید ایک بھی زولا نہ تھا جو ڈریفیوس کے کیس کے لیے کئی برس تک لڑتا رہا اور بالآخر اُس نے قانون کی خامیوں اور عدالتی پیچیدگیوں اور حکمرانوں کے تعصب کو بے نقاب کرتے ہوتے ڈریفیوس کو آزاد کرا دیا تھا۔

قانون کا احترام کرنا اسلام نے سکھایا ہے

اس کتاب کا زولا اور ڈریفیوس والا باب ایک معذرت نامہ ہے۔ جب زولا مرا تو ڈریفیوس زندہ تھا اور ڈریفیوس نے زولا کے جنازے میں شرکت کی تھی۔

بھٹو کو اپنے کسی ایسے حق گو محسن کے جنازے میں شرکت کی مہلت نہ ملی کیونکہ بے لچک معاشروں میں زولا جیسے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔

چونکہ ایک دوسرے رویّے کو سامنے لانا تھا اس لیے اس کتاب میں روزن برگ جوڑے کی پھانسی کا باب باندھا گیا ہے۔

بے لچک اور متعصب معاشرے بعض اوقات بہرے بن جاتے ہیں۔ ڈیگال، نہرو، ژاں پال سارتر، ایلبیا اہرن برگ اور دنیا کے جانے کتنے سربراہانِ مملکت اور دانشوروں اور عام آدمیوں نے روزن برگ جوڑے کی جاں بخشی کے لیے اپیلیں کیں لیکن کسی اپیل کی شنوائی نہ ہوئی اور روزن برگ جوڑے کو ۲۲ مارچ ۱۹۵۳ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

یہ کتاب اس لیے بھی ایک معذرت نامہ ہے کہ ژاں ژینے کو سارتر اور کامیو مل گئے تھے اور ایک چور ڈاکو بداخلاق اور قاتل کو صرف اُس کے صاحبِ تصنیف ہونے کی وجہ سے آزاد کر دیا گیا تھا۔

اور بھٹو جس نے "متھ آف انڈی پنڈنس" جیسی کتاب لکھی —— اُسے پھانسی دے دی گئی!

اگر بھٹو کو پھانسی نہ دی گئی تو ہم تحریک چلائیں گے

اپنی اور اپنے جیسے سب لوگوں کی کوتاہیوں کا احساس کرتے ہوئے معذرت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید بھٹو کی موت پر کوئی فیض روزن برگ جوڑے کی موت کی طرح "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ——— جیسی نظم لکھ سکے اور شاید ہی کوئی دوسرا کرشن چندر پیدا ہو جو روزن برگ جوڑے کی موت کی طرح بھٹو کی موت پر بھی "سب سے بڑا گناہ" جیسی کہانی لکھ سکے۔

یہ کتاب سراسر احساساتی اور انسانی سطح پر لکھی گئی ہے۔ اس کے پس منظر میں ایک تجسس ہے تاریخ کے روشن اور سیاہ تذکرے ہیں۔

والٹیر کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے پادری تیار نہ تھے لیکن تین چار دہائیوں کے بعد جب اُس کی لاش پروشیا سے واپس فرانس لائی گئی تو وہ فرانس کا قومی ہیرو تھا۔

یہ کتاب ایک عاجزانہ کوشش ہے احساساتی سطح پر کوئی حتمی انداز لیے بغیر ——— ٹرومین کیپوٹے کی ‘The Cold Blood’ کی تقلید میں۔

اس کتاب کا منبع وہ سوچ ہے جس کی تحریک آرتھر ملر سے ملتی ہے کہ وہ ایک غریب گھر کے نوجوان کے دفاع کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا جس پر قتل کا الزام تھا اور آرتھر ملر نے اُسے بے گناہ ثابت کر دیا۔

یہ کتاب فرانز فینن جیسے انقلابی کی خدمت میں بھی ایک معذرت نامہ ہے اور اپنے اپنے دائروں میں مقید اس ملک کے عوام کی کوتاہیوں کا بھی ایک اظہار ——— کہ جو یا تو وقت سے پہلے باہر نکلتے ہیں یا وقت گزر جانے کے بعد۔

اس کتاب میں مولانائے روم کے الفاظ میں اپنے اُن رویوں پر بھی معذرت کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے جو احترامِ آدمیت یعنی سب سے بڑی عبادت کی بھی نفی کرتے ہیں۔ وہ شخص جو اس ملک کا وزیرِ خارجہ، صدر اور وزیرِ اعظم رہا جب اُسے پھانسی دی گئی تو وہ صرف ذوالفقار علی بھٹو تھا اور تمام سچائیوں کو ملیا میٹ کرتے ہوئے یہ ظلم روا رکھا گیا کہ اُس سے اُس کا سب سے بڑا اعزاز چھیننے کی کوشش کی گئی ہے۔

بھٹو اس ملک کا پہلا، واحد اور شاید آخری منتخب وزیرِ اعظم تھا۔ آج کی جمہوریت کی بنیاد رُوسو کے سوشل کانٹریکٹ پر رکھی گئی ہے۔ یعنی وہ معاہدۂ عمرانی جو جنرل ول ‘Gen – Will’ اور ‘Particular Will’ سے طے پاتا ہے یعنی اجتماع کا فیصلہ، رائے عامہ (Gen – Will) چند لوگوں کو منتخب کر کے Particular Will اپنے اختیارات کو اُن کے سپرد کر دیتی ہے اور یہ کتاب اس المیے کا بھی معذرت نامہ ہے کہ جس شخص کو پھانسی دی گئی وہ منتخب تھا اور انتظامیہ کے جس سربراہ نے پھانسی کی توثیق کی وہ عوام کا منتخب نمائندہ نہیں تھا۔

شاید اُس نظریۂ ضرورت کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ یہ کتاب اُس کی متحمل ہو سکتی ہے جو نظریۂ ضرورت ہمارے ایک بڑے قانون دان نے ایک غیر ملک سے مستعار لے کر اپنے ہاں رائج کروایا۔ جس کے بل بوتے پر موجودہ حکومت کو قائم کیا گیا اور غالباً اس نظریۂ ضرورت کے ڈانڈے اُس خاص نظریۂ ضرورت سے بھی جا ملتے ہیں جس کے "موجد" پاکستان کے ایک بہت بڑے عالمِ دین نے فرمایا تھا کہ ضرورت کے وقت جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے اور خدا کے پیغمبر بھی اس سے مبرا نہیں تھے۔

لیکن بھٹو کے لیے جھوٹ اور سچ کی کوئی گنجائش شاید نہیں چھوڑی گئی تھی۔ یہ کتاب اس لیے بھی معذرت نامہ ہے کہ دکھ، صدمے، سکتے، جذبات اور غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے ہم نے یہ بھلا دیا کہ پھانسی اُس بھٹو کو دی گئی ہے جس پر ایک شخص کو قتل کروانے کا الزام تھا۔ مقدمہ عام فوجداری قوانین کے تحت چلایا گیا اور پھانسی کی سزا پر عملدرآمد بھی اسی قانون کے تحت ہوا اور پھانسی اُس بھٹو کو نہیں دی گئی۔

جو ایک انسان تھا، سیاست دان تھا، مصنف تھا۔ اس ملک میں سماجی اور سیاسی شعور کی ایک نئی تحریک لے کر آیا تھا۔ وہ تحریک جو مٹ نہیں سکتی ——— مر نہیں سکتی۔ خواہ اُس کا کریڈٹ بھٹو کو دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

وہ بھٹو جس نے فیض کے الفاظ میں عوام کو دھول سے ماتھے اُٹھانے کا سبق دیا، جس نے انسانوں کو عزتِ نفس کا احساس دلایا جس نے محروم طبقوں کو سر اٹھانے کا چلن دیا۔ جو اس ملک کا پہلا اور واحد منتخب وزیرِ اعظم تھا جو اس ملک کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اُس بھٹو کو پھانسی نہیں دی گئی۔ وہ بھٹو پھانسی نہیں چڑھا، وہ بھٹو کبھی پھانسی نہیں چڑھ سکتا کیونکہ جب انسان ——— تحریک بن جاتے ہیں تو غالب کے الفاظ میں انہیں پھانسی نہیں دی جا سکتی "کیونکہ وہاں اف ان کی نہیں" دار و رسن کی آزمائش" ہوتی ہے۔

احساساتی سطح پر یہ کتاب قوتِ متخیلہ کی ایک عاجزانہ کوشش ہے کہ مرنے والا آخری لمحوں میں کیا سوچ رہا تھا۔ رالف گرین کے "The Odd man" کا پادری صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اُس شخص کی آنکھوں کو دیکھے جو مرنے والا ہے۔ یہ کتاب بھی ایک ایسی ہی سفاک معصوم اور منتجانہ کوشش پر مبنی ہے اور فیض نے کہا تھا

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
اس جان کی تو کوئی بات نہیں یہ جان تو آنی جانی ہے

- یہ کتاب اس لیے بھی اس ملک کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرف سے زندہ بھٹو ——— مردہ بھٹو کی خدمت میں ایک معذرت نامے کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہم اپنی اپنی کوتاہیوں، بے بسیوں اور لاچاریوں میں جکڑے ہوئے آج صرف معذرت کا اظہار کر سکتے ہیں۔

بھٹو نے معذرت نہیں کی تھی۔ ورنہ رحم کی اپیل داخل ہو چکی ہوتی۔

ہم معذرت کے عادی ہیں برسوں سے شاید صدیوں سے کیونکہ ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں اور جو شخص معذرت کرنا نہیں جانتا اس کا انجام، تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ بیشتر صورتوں میں بھٹو کے انجام سے مختلف نہیں ہوتا۔

* * *

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

* * *

جب روزنبرگ جوڑے کو پھانسی دی گئی تو کرشن چندر نے ایک کہانی "سب سے بڑا گناہ" اور فیض صاحب نے ایک نظم لکھی: "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے...."

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پر وارے گئے
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

روزنبرگ جوڑے نے بھی آخری دم تک "اقرارِ جرم" نہ کیا تھا۔

○

بھٹو چاہتے تھے کہ پاکستان ایک ایٹمی توانائی پیدا کرنے والا ملک بن جائے۔ امریکہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ امریکہ ایسا کیوں نہیں چاہتا تھا؟ اس کا جواب نہ مانگئے۔ بس امریکہ نہیں چاہتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا۔ مجھ جیسے لوگ تو۔ اس سوال کا جواب دے ہی نہیں سکتے ہیں۔ ایسے سوالوں کا جواب تو کوئی م۔ ص جیسا صحافی ہی دے سکتا ہے کہ جس کے ہنری کسنجر کے ساتھ "ذاتی تعلقات" اور "مراسم" ہوں۔ اور وہ اس تعلقِ خاطر اور مراسم پہ نازاں بھی ہو، ڈھنڈورا بھی پیٹتا ہو۔ اس ہنری کسنجر کے ساتھ دوستی پہ ناز کرنا میرے جیسے آدمی کو تو کچھ عجیب لگتا ہے کہ جس نے میرے ملک کے منتخب وزیرِاعظم کو دھمکی دی ہو کہ — فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ منسوخ کر دو۔ پاکستان کو ایٹمی توانائی سے مالامال کرنے کا ارادہ دل سے نکال دو۔ ورنہ ہم تم سے نمٹ لیں گے اور تمہارا برا حشر ہوگا!

پاکستان کے وزیرِاعظم کی حیثیت سے "قاتل" بھٹو نے فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا تو — امریکہ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اور ہنری کسنجر نے جب ایک بڑے اسلامی ملک کے وزیرِاعظم کو ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا تو۔ پھر دھمکی بھی دے دی۔

روزنبرگ جوڑے کو اسی لیے پھانسی دی گئی تھی کہ اس پہ امریکی حکام نے الزام لگایا تھا کہ انہوں نے ایٹم بنانے کا راز چرا کر روس کے حوالے کر دیا ہے۔

اور ہنری کسنجر نے۔ جو اس وقت امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ تھے۔ جناب بھٹو کو اسی لیے برے انجام کی دھمکی دی تھی۔ کہ بھٹو پاکستان میں ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ لگانے کا تہیہ کر چکے تھے۔

اور اب جبکہ بھٹو کو پھانسی دی گئی ہے۔ تو — امریکہ نے اسی بہانے سے پاکستان کی امداد بند کر دی ہے۔ جبکہ مارشل لا حکومت کا دعوےٰ تھا کہ بھٹو۔ اب حکومت میں نہیں رہا۔ اسی لیے امریکہ کی مخالفت کو حمایت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے......

بہرحال۔ امریکہ اور پاکستان کی مخالفت اور اب امریکی امداد بند کر دینے اور پاکستان ملک ایٹمی توانائی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو امریکہ کو کیا تکلیف پہنچتی ہے — اور ان سب سوالوں کا جواب بہتر انداز میں م۔ ص صاحب جیسے صحافی ہی دے سکتے ہیں۔ جو امریکہ کے معاملہ میں ایکسپرٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور قریبی تعلقات بھی۔

مجھے تو روزنبرگ جوڑے کی پھانسی کا قصہ سنانا ہے۔ اور بھٹو کا ذکر کرنا ہے جسے ہنری کسنجر نے دھمکی دی تھی!

ہنری کسنجر نے جناب بھٹو کو جو دھمکی دی تھی۔ بھٹو نے اس کو "خفیہ" نہیں رکھا تھا اپنے بلند آہنگ اور نڈر لہجے اور انداز میں بھٹو نے اس دھمکی کو کئی بار دہرایا۔ قوم کو بتایا اور ساری دنیا کے اخباروں میں یہ دھمکی شائع ہوئی۔ بھٹو۔ کوٹ لکھپت جیل اور راولپنڈی جیل میں بھی۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں جب ان کو اپنی زندگی کے لالے پڑے تھے۔ ملک کے اس اہم مسئلے پر سوچا کرتے تھے اور انہیں اس معاملے سے بڑی دلچسپی رہی۔

تاریخ کا حافظہ کمزور نہیں ہوتا۔ پاکستان جب بھی۔ اس منزل تک پہنچے گا۔ جب بھی ایٹمی توانائی پیدا کرنے کے قابل ہوگا تو تاریخ یہ بتائے گی کہ اس کام کا آغاز کس نے کیا تھا۔ اور وہ کون تھا جو اپنے ملک کے مفاد کے لیے امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ٹکرا گیا تھا۔ اور جس کو ہنری کسنجر نے دھمکیاں دی تھیں۔

اس باب میں بھی بھٹو کو بھلانا ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ تاریخ کسی کو نہیں بھولتی!

روزنبرگ جوڑے کو ایٹمی راز چرا کر روس کے حوالے کرنے کے جرم میں امریکہ میں پھانسی دی گئی تھی۔

نیویارک جیسے بڑے اور بین الاقوامی شہر میں۔ ایتھل اور جولیس روزنبرگ میاں بیوی ایک محلے میں رہتے تھے۔ ان کے دو چھوٹے بچے تھے۔ رابی اور مائیکل۔ یہ ایک متوسط کنبہ تھا۔ جولیس پیشے کے اعتبار سے۔ انجنیئر تھا۔ چھوٹی سی ورکشاپ میں دن رات کام میں مصروف رہتا۔ آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ لیکن وہ ان محدود ذرائع سے ہی اپنے گھر کو خوشگوار بنانے میں کامیاب تھے۔ کیونکہ انہیں اس لالچی اور سرمایہ دار معاشرے میں دولت سے زیادہ اپنے پیارے پیارے بچوں سے محبت تھی۔

اس پُرسکون گھر میں ایک دن ایسا دھماکہ ہوا، جس کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی۔ یہ دھماکہ ایتھل کے بھائی اور جولیس کے سالے۔ ڈیوڈ گرین نے کیا تھا۔

ڈیوڈ گرین۔ لالچی نکما اور اوباش تھا۔ وہ اکثر جولیس سے پیسے اینٹھتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے جولیس روزنبرگ سے چار ہزار ڈالر مانگے۔ جولیس کے لیے اتنی بڑی رقم فراہم کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اتنی رقم خود اس کے پاس بھی نہ تھی۔ وہ گرین کی چھوٹی موٹی ناجائز ضرورتیں تو پوری کر دیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا یہ تقاضا پورا کرنا۔ جولیس کے بس میں نہ تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

گرین نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اس انکار کا اسے ایسا مزہ چکھائے گا کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے گا!

اور پھر وہ دھماکہ ہوا، جس کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی۔

جون ۱۹۵۱ء میں پولیس آئی اور جولیس اور ایتھل کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے۔ بے آسرا ہو گئے۔

ایک نہ ایک وعدہ معاف گواہ — ہر مقدمے میں مل سکتا ہے۔ مل جاتا ہے!

اور جب۔ سگا بھائی اور سالا۔ وعدہ معاف گواہ بن جائے تو پھر۔ کس شہادت اور ثبوت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

قانون کے اپنے تقاضے ہیں۔ قانون کی اپنی حدود ہیں اور قانون کا فیصلہ انہی حدود میں ہوتا ہے۔ بھٹو کیس میں مسعود محمود۔ وعدہ معاف گواہ بن جاتا ہے۔ صفائی

کے وکلاء اس کے بیان کے تضادات، اس کی شخصیت کی خامیوں اور کمزوریوں پر کتنے ہی دلائل پیش کر رہے تھے۔ لیکن وہ جناب بھٹو کا معتمد تھا اور اس نے شریکِ جرم ہونے کا اقرار کیا تھا اور قانون کی حدود میں قانون کے تقاضوں کو اس کی شہادت پوری کرتی تھی۔

گرین نے اعتراف کیا کہ وہ خود جاسوس ہے اور وہ دوسرے ملکوں کے لیے اپنی بیوی رُتھ کے ساتھ مل کر جاسوسی کرتا ہے۔ اُس نے جولیس اور ایتھل (بہنوئی اور بہن) کے کہنے پر الاماس پروجیکٹ سے ایٹم بم بنانے کا خفیہ راز چرایا اور ان کے حوالے کر دیا۔ جسے ایتھل اور جولیس نے روس پہنچا دیا۔

قانون کے مطابق۔ وعدہ معاف گواہ کی جاں بخشی ہو گئی۔

اور ایتھل اور جولیس کو موت کی سزا سنا دی گئی۔

گرین کی بیوی۔ جو خود جاسوس تھی۔ اُسے بھی بری کر دیا گیا۔

اس مقدمے کا چرچا ساری دنیا میں ہوا۔ عالمی رائے عامہ نے احتجاج کیا۔ کئی ملکوں کے دانشوروں، ادیبوں، ملکوں کے سربراہوں، اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز سرکاری عہدے داروں اور وزراء نے اس جوڑے کی جاں بخشی کے لیے امریکی صدر سے اپیلیں کیں۔ لیکن۔ امریکی صدر نے ہر اپیل کو مسترد کر دیا!

روزنبرگ جوڑے کے خلاف۔ سب سے اہم گواہی اور ثبوت۔ گرین کی شہادت تھی۔ یہ شہادت انتہائی ناقص، کمزور اور ناقابلِ اعتبار تھی۔ لیکن اس کو معتبر سمجھا گیا۔ پھانسی کی سزا کے خلاف اپیل ہوئی تو سیکنڈ ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

”اگر وعدہ معاف گواہ گرین کی گواہی پہ اعتبار نہ کیا جائے تو اس مقدمے میں کوئی جان نہیں۔“

بھٹو کیس میں۔ مسعود محمود کی گواہی کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مسعود محمود کی گواہی میں بھی بے پر کی کئی باتیں اڑائی گئی تھیں۔ اور۔ خود عدالتِ عالیہ کے کچھ ریمارکس بھی اس گواہی اور وعدہ معاف گواہ کے متعلق بڑے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔

گرین۔ جو معمولی پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے اپنی گواہی میں کہا کہ اس نے ایٹم بم کا نسخہ۔ زبانی یاد کر لیا تھا اور زبانی ہی ایتھل اور جولیس کو سنایا تھا۔

ڈیوڈ گرین جیسے شخص کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ایٹم بم بنانے کا نسخہ بڑا پیچیدہ مشکل اور انتہائی ٹیکنیکل ہے۔ ڈیوڈ گرین کی اس گواہی اور غیر معمولی صلاحیت پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکہ کے ہی ایک سائنسدان نے کہا تھا۔

”ڈیوڈ گرین جیسے شخص کے لیے ایٹم بم بنانے کا طریقہ ازبر کر لینا۔ ایک ایسا ہی دعوے ہے کہ ڈیوڈ گرین یہ کہے کہ اس کے دوڑنے کی رفتار آواز سے بھی تیز ہے۔“

اور پھر اس جرم کی نوعیت بھی دیکھیے کہ جس کی پاداش میں روزنبرگ جوڑے کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ وہ جرم۔ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ خفیہ نہ تھا۔ کیونکہ ایٹم بم بنانے کا نسخہ۔ ”راز“ نہ رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ایک ”کھلے راز“ کی سی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۹ء میں امریکہ کے ایٹمی جوہری کمیشن کی رپورٹ میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ:

”روس ۱۹۴۰ء سے ہی ایٹم بم بنانے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے۔“

اب یہ سوال نہ پوچھیے کہ جب ۱۹۴۰ء میں ہی روس ایٹم بم بنانے کی قدرت رکھتا تھا۔ تو پھر ایٹم بم بنانے کا راز۔ راز کیسے رہا۔ اور ان لوگوں کو پھانسی کیوں دی گئی۔ جن کی عمر اس وقت ۳۳/۳۴ برس تھی۔ اور جن کے دو چھوٹے چھوٹے پیارے بچے تھے۔

لاہور ہائیکورٹ میں بھٹو کیس میں استغاثہ نے اپنے جن گواہوں کی فہرست پیش کی ان کی تعداد سو سے زیادہ گواہوں پر مشتمل تھی۔ لیکن بعد میں خود استغاثہ

’ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے‘

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے!

* * *

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی مہکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

* * *

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

* * *

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جان گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض احمد فیضؔ (منٹگمری جیل ۱۵ مئی ۱۹۵۴ء)

ہم ہیرو یا شہید بننا نہیں چاہتے

جوانی میں موت کسے پسند ہے

نے اپنے ہی گواہوں کو بھگتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

پنجاب کے سابق وزیرِ اعلیٰ محمد حنیف رامے کا نام بھی استغاثہ کے گواہوں میں شامل تھا اور پھر استغاثہ نے ان کے بارے میں کہا کہ چونکہ وہ بھٹو سے مل گئے ہیں۔ اسی لیے اب استغاثہ انہیں بطور گواہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔

روزنبرگ جوڑے کے خلاف سرکار کی طرف سے گواہوں کی جو فہرست پیش کی گئی وہ ۱۱۳ گواہوں پر مشتمل تھی۔ سرکاری گواہوں کی اس فہرست میں حکومت نے عالمی سائنسدانوں، ایف بی آئی اور خفیہ پولیس کے ایجنٹوں کے علاوہ روزنبرگ جوڑے کے ان دوستوں کے نام بھی شامل کیے تھے۔ جو جاسوسی میں ان کی مدد کرتے تھے۔

لیکن ـــ استغاثہ نے بعد میں ان میں سے اپنے ہی موقف کو ثابت کرنے کے لیے۔ اپنے ہی سب گواہوں کو ترک کر دیا۔ کسی کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور صرف ـ وعدہ معاف گواہ، گرین کی شہادت پر ہی۔ پھانسی کی سزا سنائی اور آخر دم تک بحال رکھی۔

دنیا بھر سے رحم کی اپیلیں آئیں۔ مسترد کر دی گئیں۔

روزنبرگ جوڑے کو ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے رحم کی اپیل کریں تو ان کی موت کی سزا تبدیل ہو سکتی ہے۔

لیکن انہوں نے ناکردہ گناہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

پاکستان میں بھی اکثریت کا خیال ہے کہ اگر بھٹو خود رحم کی اپیل کرتے تو ان کی جاں بخشی ہو جاتی۔ لیکن ـــ یہ رائے بھی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ بھٹو کی جاں بخشی مشکل تھی۔ انہیں بہر حال پھانسی پہ لٹکانا طے پا چکا تھا۔ کیونکہ سپریم کورٹ انہیں پھانسی دے چکی تھی اور جنرل ضیا الحق بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ وہ عدالت کے فیصلے پر عمل کریں گے۔ اور عدالت جو فیصلہ دے گی اس کے پابند ہوں گے لہٰذا

سو ایک لحاظ سے اچھا ہوا کہ۔ رحم کی اپیل خود بھٹو نے نہ کی۔

ورگرنہ ـــ وہ رائیگاں جاتی !!

اپنی موت کوئی کب چاہتا ہے ….. اسی لیے ایتھل اور جولیس نے پھانسی کی سزا پانے سے پہلے ایک خط میں لکھا تھا:

> "ہم جوان ہیں۔ ہمیں زندگی سے محبّت ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہم ہیرو یا شہید بننا نہیں چاہتے۔ جوانی میں موت کسے اچھی لگتی ہے۔ ہم تو اپنے دونوں بیٹوں رابی اور مائیکل کو پال پوس کر اپنی آنکھوں کے سامنے جوان ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری زندگی کا ہر لمحہ ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے بچوں سے جا ملیں۔ لیکن ـــ جو جرم ہم نے کیا ہی نہیں اس کا اعتراف کیوں کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم ناکردہ گناہ کو تسلیم کر لیں تو ہم پر زندگی کے دروازے کھل سکتے ہیں. لیکن ہم بے گناہ ہیں۔ ہم سچے ہیں اور سچائی کو چھوڑ نہیں سکتے. اس سچائی کے سامنے ہماری زندگی اور اس کے تقاضے اور ہماری آرزوئیں بے وقعت اور حقیر ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے ناکردہ گناہ کو قبول نہ کیا۔ رحم کی درخواست نہ کی اور موت کو سینے سے لگا لیا۔

جب روزنبرگ جوڑے کو موت کی کرسیوں پر بٹھایا گیا تو۔ جولیس کہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ نہ اس کی نگاہ اونچی تھی نہ نیچی۔ وہ کسی معصوم اور بے گناہ انسان کی طرح موت کی کرسی پر جکڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ کرب تھا۔ نہ خوف۔ معصومیت اور سچائی تھی جس نے اس کے چہرے کو منور کر رکھا تھا۔

جلاّد نے بجلی کا بٹن دبایا۔ اور برقی رَو اسکے جسم میں دوڑ گئی اور وہ مر گیا !!

لیکن ایتھل۔ جو دو بچوں کی ماں تھی۔ وہ موت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی۔۔ بجلی کے پہلے جھٹکے سے ہلاک نہیں ہوئی۔ ایک بار ـ دو بار۔ تین بار، اس کے جسم سے برقی رَو دوڑائی گئی۔ ہر جھٹکے پر۔ اس کا سینہ دھمک کر آگے آ جاتا تھا۔ تیسرے جھٹکے کے بعد وہ مری. پہلے جھٹکے اور تیسرے جھٹکے کے درمیان ـــ نہ وہ تڑپی نہ چیخی۔ نہ چلاّئی۔ اس نے ہر اذیت خاموشی سے سہی۔

اور جب تارا مسیح نے بھٹو کے چہرے پر نقاب چڑھایا تو بھٹو نہ چیخے نہ تڑپے۔

ان کے آخری الفاظ۔ جو ہم تک پہنچے ہیں۔ وہ یہ تھے:

"FINISH IT"

ایتھل اور جولیس کے کمسن بچے۔ ایک مخیر اور رحمدل گھرانے میں پرورش پانے لگے۔ انہیں نہ بتایا گیا کہ وہ۔ کن لوگوں کے نورِ چشم ہیں۔ ان لوگوں کے نام بدل دیے گئے تھے۔ پچھلے برس ۱۹۷۸ء میں رابی اور مائیکل کو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ روزنبرگ جوڑے کی اولاد ہیں۔ اب وہ بالغ ہو چکے ہیں اور انہوں نے اعلان کیا ہے کہ ان کے والدین بے گناہ تھے اور وہ اپنے والدین کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کریں گے۔

روزنبرگ جوڑا۔ دنیا کو لرزا گیا۔ آج ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ فیض ہیں۔ کرشن چندر ہیں۔ ایلیا ایرن برگ ہیں اور تیسری دنیا اور یورپ کے کتنے ہی ادیب اور شاعر۔ جنہوں نے روزنبرگ کو ادب میں، شعر میں۔ زندہ کر دیا ہے۔

آنے والی نسلیں۔ انسانی تاریخ بھی انہیں یاد رکھے گی!

اور بھٹو کو بھی ـــــــــــ !!

ڈریفیوس اور زولا، بھٹو اور ؟

بھٹو کو کوئی زولا نہ مل سکا!

پاکستان میں ایسے صحافیوں، ایسے ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ جنہوں نے بھٹو کے عہد میں بہت فائدے اٹھائے اور بھٹو کے بہت گن گائے۔ ان میں ایسے صحافیوں، ایسے ادیبوں کی بھی کمی نہیں۔ جو بھٹو کے نظریات پر اعتماد و ایمان رکھتے تھے۔ بھٹو اور پیپلز پارٹی کے منشور کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے۔

اس کے باوجود بھٹو کے لیے کوئی لکھنے والا زولا نہ بن سکا!

ممکن ہے۔۔۔۔ جب بھٹو کا کیس۔ دوبارہ غور کے قابل سمجھا جائے تو اس وقت کوئی لکھنے والا بھٹو کے لیے زولا بننے کی کوشش کرے۔ لیکن تب وقت گزر چکا ہو گا اور جو کردار زولا نے ڈریفیوس کیس میں ادا کیا تھا۔ اُسے شاید پاکستان کا لکھنے والا ادا نہ کر سکے۔

یہ اپنی جگہ ایک اہم بحث ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں زولا جیسے باضمیر اور انصاف کی جنگ لڑنے والے ادیب کیوں جنم نہیں لیتے۔

عالمی ادب میں زولا کا جو مقام ہے۔ وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زولا کے ادبی نظریات اور زندگی کے بارے میں کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ زولا کا وہ منشور پیش کر دیا جائے۔ جو زولا نے خود لکھا ہے:

"ہمارے نزدیک تمام حقیقتیں خوبصورت ہیں۔ خواہ ظاہری دکھاوے میں ان کا چہرہ کتنا ہی گھناؤنا کیوں نہ ہو۔ ہم قدرت سے ترکِ تعلق نہیں کرتے۔ بلکہ اسے قبول کرتے ہیں اور قدرت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل کا حال معلوم کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تلخ سچائی میٹھے جھوٹ سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کچی مٹی کی مہک میں دنیا کے تمام دیراتوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ ہم 'درد' کو اچھا سمجھتے ہیں کیونکہ یہ انسانوں کے تمام جذبات کا سرتاج ہے۔ تمام جذبات اور احساسات اسی چشمے سے پھوٹتے ہیں۔ ہم ـــــ کردار کو بھونڈے پن، سچائی کو جھوٹ، درد کو خوشنمائی اور چمک دمک پر ـــــ "تلخ حقیقت کو دنیا بھر کی تمام دولت پر ترجیح دیتے ہیں۔

"ہم صرف زندگی کے خاص اجزا یا مسائل کو قبول نہیں کرتے۔ بلکہ ہم زندگی کو خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ پورے دل سے قبول کرتے ہیں۔"

"ہم زندگی کی اسی قبولیت میں روایتی اخلاقی فیصلوں کے پابند نہیں! ہمیں یقین ہے کہ ایک طوائف اور نواب زادی میں، سرمایہ دار اور مزدور میں، کمانڈر اور سپاہی میں، کاشتکار اور وزیر میں، کوئی فرق نہیں ہے۔ کیوں یہ سب قدرت کی مخلوق ہیں۔ اصل سب کی ایک ہی ہے اور سب زندگی کے پورے نظام کا جزو ہیں۔"

زولا کے اس ادبی منشور پر بہت باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت ڈریفیوس کا مقدمہ پیش کرنا مقصود ہے۔ جس میں زولا نے ایک اہم کردار ادا کیا اور فرانس کی سیاسی، معاشرتی، قانونی اور اخلاقی زندگی پر اہم اثرات چھوڑے۔

الفریڈ ڈریفیوس فرانسیسی فوج کا ایک افسر تھا۔ غداری کے الزام میں اس پر جو مقدمہ کھڑا کیا گیا، وہ بارہ برس تک چلتا رہا۔ بارہ برس تک اس مقدمے کے حوالے سے پورا فرانس متاثر ہوا۔ اس مقدمے نے فرانس کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ ڈریفیوس پر الزام تھا کہ اس نے بعض فوجی راز جرمنوں تک پہنچائے ہیں اور یوں ملک سے غداری کی ہے۔ ثبوت کے طور پر ایک خط پیش کیا گیا، جس کا مصنف ڈریفیوس کو ٹھہرایا گیا۔

پندرہ اکتوبر ۱۸۹۴ کو ملٹری کے اعلیٰ حکام نے ڈریفیوس کو حراست میں لے لیا! دسمبر ۱۸۹۴ میں فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کے فیصلے کے مطابق اُسے مجرم قرار دیا گیا۔ اُسے عمر بھر کی جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ سزا کے فی الفور بعد اُسے ڈیولز آئیلینڈ (DEUILS ISLAND) میں بھیج دیا گیا، جہاں عمر بھر اُسے جلاوطنی کی سزا بھگتنا تھی۔

ڈریفیوس آخری وقت تک جرم سے انکار کرتا رہا!

جس طرح پاکستان میں نواب محمد احمد خاں کے قتل کے سلسلے میں بھٹو کو گرفتار کیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی بھٹو کے خلاف پروپیگنڈہ کی توپوں کے دہانے کھل گئے۔ اسی طرح ڈریفیوس کے ساتھ ہوا تھا۔ بھٹو کے خلاف "رائٹسٹ" (دائیں بازو کے صحافی اور پریس لکھتے وقت وہ بات نہیں بنتی جو RIGHTIST سے بنتی ہے) پریس نے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کو پھانسی پر چڑھانے کا مطالبہ بھی شروع ہو گیا۔ قانون اور انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہمارے ملک کے دائیں بازو کے پریس اور صحافیوں نے بھٹو کی شخصیت اور ذات کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ اسی دور کے دائیں بازو کے اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ بہرحال ان صحافیوں اور پریس نے اخلاق کے تمام ضابطوں اور اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر خاص مقصد کے تحت بھٹو کے بارے میں سکینڈل اور من گھڑت کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔

ایک دھڑا انصاف کا طلب گار دوسرا جانے کا دشمن

ڈریفیوس کے ساتھ بھی فرانس میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ اینٹی سامی پریس اُسے فیصلے سے پہلے ہی غدّار اور وطن دشمن قرار دینے لگا تھا۔ حالانکہ ابھی عدالت نے اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا اور ڈریفیوس کے عزیز و اقارب قانونی چارہ جوئی میں مصروف تھے۔

اس وقت فرانس میں دو دھڑے بن گئے۔ ایک دھڑا، ڈریفیوس کا جان دشمن اور دوسرا انصاف کا طلبگار تھا۔

وہ خط جس کی بنیاد پر ڈریفیوس کو ملزم اور پھر مجرم قرار دیا گیا۔ اس کا خط مسوادِ تحریر ـــ ڈریفیوس کے ہینڈ رائٹنگ سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے خلاف جو گواہیاں اور شہادتیں پیش کی گئیں۔ وہ سب کی سب جھوٹی تھیں۔ دراصل سامی اینٹی ہونے کی وجہ سے ڈریفیوس کے خلاف ایک سازش کھڑی کی گئی تھی۔ اصل مجرم اور لوگ تھے۔

پاکستان سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل کے خلاف جو فیصلہ لکھا۔ اس میں تین ججوں نے بھٹو کو بے گناہ ثابت کرتے ہوئے اُسے رہا کرنے کا فیصلہ دیا تھا۔

ڈریفیوس کے مقدمے میں فوجی عدالت کے فیصلے کو فرانسیسی سینیٹ کے وائس پریذیڈنٹ کیسلر نے رد کر دیا۔ اُسے ڈریفیوس کی بے گناہی پر یقین تھا۔ کیسلر نے فرانس کے وزیرِ اعظم سے

استدعا کی کہ فوجی عدالت کا فیصلہ رد کر دیا جائے اور اُسے نہ صرف یہ کہ آزاد کیا جائے بلکہ فوج میں اس کا عہدہ اور ملازمت بھی بحال کر دی جائے۔

ڈریفیوس کے مقدمے میں (بھٹو کے مقدمہ کے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کو سامنے رکھئے۔ وہ جرم میں شریک تھا) جس شخص نے وہ خط درآمد کیا تھا، جس کا مصنف ڈریفیوس کو ٹھہرا کر اُسے مجرم قرار دیا گیا تھا۔ وہ شخص میجر جوزف ہنری تھا، جسے حقیقت کا علم تھا کہ یہ خط، جس کی بنیاد پر ڈریفیوس کو مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ جعلی ہے، جھوٹا ہے، لیکن ڈریفیوس کو نہ صرف یہ کہ سزا سنا دی گئی بلکہ اُسے جلا وطن بھی کر دیا گیا۔

ڈریفیوس کیس کو فرانس میں سیاسی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح پاکستان میں۔ اب خواہ یہ لاکھ کہا جائے کہ بھٹو کیس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن پریس اور سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ نے اسے سیاسی رنگ دیدیا تھا۔ اور یہ رنگ ہزار وعدوں اور پردوں کے باوجود بھی چھپائے نہ چھپ سکا۔ اگر ایسا نہیں بھی تھا تو ہر باشعور اور عوام کے مزاج سے آشنا۔ لکھنے والا، صحافی اور باضمیر انسان یہ جانتا ہے کہ پاکستان کے کروڑوں عوام یہ کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں کہ بھٹو کے کیس، اس کی سزا اور اس کی پھانسی میں، سیاست کا عنصر شامل تھا۔

عوام کے دلوں سے یہ بات کوئی نہیں نکال سکتا اور نہ ہی اسے نکالا جا سکتا ہے!!

بھٹو کا کیس ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ میں پہنچا، اپیل رد ہوئی "نظر ثانی" کی درخواست بھی مسترد کر دی گئی۔ لیکن پاکستان کا کوئی لکھنے والا، کوئی ادیب بھٹو کے حق میں آواز اٹھانے کے لیے نہ نکلا!

کیا ہر پاکستانی ادیب، صحافی اور دانش ور بھٹو کو مجرم سمجھتا ہے ——؟

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر لکھنے والے، ہر پاکستانی صحافی اور ادیب کو یقین تھا کہ ——

بھٹو مجرم ہے!

یا بھٹو کے لیے آواز اٹھانا بے کار جائے گا؟

ان سوالوں کا جواب کون دے؟!

ہاں، ہم اتنا جانتے ہیں اور ایسی کئی مثالیں دے سکتے ہیں کہ پاکستان کے کسی لکھنے والے کو اگر "ملک دشمن سرگرمیوں" امن عامہ کے تحفظ، "سیفٹی ایکٹ" "کالے قوانین" کے تحت کبھی گرفتار کیا گیا، یا اُسے کڑی سزا دی گئی تو ادیبوں نے حکومت سے اپیلیں کیں کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے ادیبوں نے اس سے بھی کمتر بلکہ کبھی کبھی مضحکہ خیز قسم کے مسائل پر بھی افسران اور حکومت سے اپیلیں کی ہیں۔ اگر کسی شاعر، ادیب کا کسی شہر سے دوسرے شہر میں تبادلہ ہوا تو اس تبادلے کو رکوانے کے لیے بڑے بڑے ادیبوں نے کالم لکھے۔ اگر کسی کو کسی نوکری سے نکالا یا معطل کیا گیا تو ادیب میدان میں نکل آئے۔

لیکن بھٹو کے لیے، پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے مرحوم ایوب خاں جیسے "صدر"، آمر اور ڈکٹیٹر کو ادیب تسلیم کر لیا اور انہیں رائٹرز گلڈ کی رکنیت کا اعزاز دینا چاہا، وہ ادیب خاموش رہے۔

حالانکہ بھٹو کا معاملہ معمولی نہ تھا، یہ ایک انسان کی زندگی کا مسئلہ تھا اور انسان کی زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے یہ ایک لکھنے والے سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔

اور پھر بھٹو صرف ایک سیاست دان، ایک قاتل نہ تھا، ایک انسان تھا ایک مصنف تھا۔

وہ "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے مصنف کیطرح مشکوک اور جعلی مصنف نہ تھا۔ وہ "مری گمیٹ ٹریجڈی" اور "متھ آف انڈیپینڈنس" جیسی کتابوں کا مصنف تھا!!

سارتر جیسے لوگ، اگر ژاں ژینے کو صرف ایک جو ہر قابل "جرنل آف لے تھیف" اور "OUR LADY OF FLOWERS" کے خالق ہونے کیوجہ سے اس لیے میدان میں نکل آتے ہیں کہ اس چور، اس لوطی، جنسی کجروی کے شکار اور اخلاقی مجرم کو رہا کر دیا جائے —— تو ——

بھٹو کے لیے ادیبوں کیطرف سے رحم اور انصاف کی اپیل کرنا، کون سا مشکل اور جان لیوا کام تھا!!

لیکن ایسا نہیں ہوا —— ایسا نہیں ہوا ——!!

اس کے برخلاف، زولا خاموش نہ رہ سکتا تھا وہ اس طرح کا COMMITTED ادیب اور ناول نگار بھی نہ تھا۔ جیسے ادیب اور لکھنے والے بزعم خود ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اُسے ڈریفیوس کی بے گناہی کا یقین تھا اور وہ انصاف کے لیے میدان میں نکل آیا۔

جنوری ۱۸۹۸ میں زولا نے فرانس کے صدر فلیکس فارے کے نام ایک کھلا خط لکھا۔ یہ خط "AURORE" نامی اخبار میں شائع ہوا۔ اس کھلے خط کا عنوان، جو فرانس کے صدر کے نام تھا۔ زولا نے "میں الزام لگاتا ہوں" رکھا تھا۔

زولا نے اس خط میں ڈریفیوس کو بے گناہ ثابت کرتے ہوئے قانون کی خامیوں، گواہوں پر شدید احتجاج کیا تھا۔ یہ امر بے حد قابل ذکر ہے کہ اس وقت جب یہ خط شائع ہوتا ہے، ڈریفیوس کو فوجی عدالت سے سزا ہو چکی تھی اور وہ جلاوطنی کی سزا بھی بھگت رہا تھا لیکن زولا حق پر تھا اُسے نہ تو مروّجہ قانون سے خوف تھا نہ فوجی عدالت سے ....

زولا کا یہ خط ایک اہم انسانی اور تاریخی دستاویز ہے۔ جس روز یہ خط AURORE میں چھپا اُسی روز شام تک اس اخبار کی دو لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ زولا نے فرانس کے صدر کے نام اس خط میں فوجی عدالت اور اس کے بعد دوسری عدالتوں کے فیصلوں پر کڑی تنقید کی تھی۔

زولا نے اس خط میں چیلنج کیا تھا کہ وہ سچا ہے اس کا دعویٰ سچا ہے اور اگر وہ جھوٹا نکلے تو ہر کڑی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔

زولا کے اس خط نے انیسویں صدی کے فرانس کی تاریخ اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور یہ خط بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

زولا کے اس خط کے چھپتے ہی ڈریفیوس کا کیس پھر سے زندہ ہو گیا! ملک کے مختلف حصوں میں لوگ ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ ڈریفیوس کے حامیوں اور مخالفوں میں سر پھٹول ہوا۔ ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ ایک بار پھر ڈریفیوس کیس کی سماعت کا مطالبہ ہونے لگا۔

پاکستان میں ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہاں نہ کوئی زولا تھا اور نہ ہی کوئی تحریک تھی۔ اور حکومت کو فیصلہ پر عمل کرنے میں بڑی عجلت کا ثبوت دینا چاہتی تھی!!

زولا کی تحریک کے ردِ عمل میں تین ہزار شہریوں کے دستخطوں پر ڈریفیوس کیس کی نظر ثانی کے لیے درخواست پیش کی گئی۔ اس درخواست اور اپیل پر دستخط کرنے والوں میں ——

اناطول فرانس اور مارسل پروست جیسے عالمی شہرت کے بے مثل مصنف بھی شامل تھے۔

زولا جو تحریک کا بانی تھا۔ اس پر مقدمہ چلا، ظاہر ہے کہ اُسے معتوب قرار دیا ہی جانا تھا۔ اُسے توہین عدالت کا مرتکب قرار دیا گیا اور اس جرم میں اُسے ایک سال قید اور تین ہزار فرانک جرمانے کی سزا سنائی گئی۔

پاکستان میں بھٹو سے فیض حاصل کرنے والے ادیبوں کی تعداد کم نہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو بھٹو کے ساتھ اپنے ذاتی مراسم اور تعلقات کا ذکر کرتے نہ تھکتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھٹو کے لیے نہ اٹھا۔ جبکہ زولا کا ڈریفیوس سے تعارف تک نہ تھا۔ وہ شخصی اور ذاتی سطح پر اُسے بالکل نہ جانتا تھا۔ زولا کو سزا سنائی گئی۔ اس کو جرمانہ بھی کیا گیا اور ایک سال قید بھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں اس سزا کے بارے میں یہ جملے بڑے معنی خیز ہیں۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے بھٹو کو ایک دن بعد پھانسی دی گئی

The cheifs of The army put forth all Their Power and Zola was condemned.

(انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔ جلد ۲۳ صفحہ ۹۶۲)

زولا نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی۔ اس اپیل کی سماعت ۱۸ جولائی ۱۸۹۸ کو شروع ہوئی۔ زولا کے دوستوں اور وکیلوں نے اُسے مشورہ دیا اور مجبور کیا کہ وہ ملک سے چلا جائے۔ کیونکہ یہاں اس کو انصاف ملنا ممکن نہ تھا۔ فوجی حکام نے اس مسئلے کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ مجبوراً زولا کو دوستوں اور وکیلوں کے مشورے پر عمل کرنا پڑا اور وہ انگلینڈ چلا گیا۔ جہاں اُس نے سال بھر تک ”جلاوطنی“ کی زندگی بسر کی۔

حکومت پر عوامی دباؤ پڑ رہا تھا۔ وہی کشمکش جو یہاں مختلف انداز میں نظر آئی۔ فرانس میں بھی موجود تھی۔ ڈریفیوس کے حامی انصاف کے طلبگار تھے اور اینٹی سامی نہیں چاہتے تھے کہ نظرِ ثانی کی جائے لیکن عوامی دباؤ اور اس کشمکش کا نتیجہ ایک اور صورت میں نکلا۔

میجر ہنری نے اگست ۱۸۹۸ء میں خودکشی کر لی۔ خودکشی سے پہلے اُس نے ڈریفیوس کی بے گناہی کا اعتراف کیا اور جس خط اور ثبوت کی بنا پر ڈریفیوس کو مجرم قرار دے کر سزا دی گئی تھی۔ اُسے جعلی اور جھوٹا تسلیم کر لیا۔ وہ فوجی افسر جنہوں نے دراصل اس سازش کو تیار کیا تھا، وہ میجر ہنری کی خودکشی کے بعد خوفزدہ ہو کر ملک سے فرار ہو گئے۔

فرانس میں ایک نئی حکومت قائم ہو گئی۔ نئی وزارت بنی جو نظرِ ثانی کے حق میں تھی۔

ڈریفیوس کیس اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ڈریفیوس کو سزا سنائے چار سال ہو چکے تھے وہ ڈیولز آئیلینڈ میں سزا بھگت رہا تھا۔ ان چار برسوں میں پانچ حکومتیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ لیکن فوج اور فوجی افسران و حکام کی بالادستی بدستور قائم رہی تھی!

ڈریفیوس کو انصاف حاصل کرنے میں بارہ برس لگے۔ ان بارہ برسوں میں نہ صرف فرانس کے عوام اور دانشوروں نے اس کیس کو زندہ رکھا اور انصاف کا مطالبہ کرتے رہے بلکہ اب یورپی ممالک کے عوام بھی اس کیس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

اس دوران میں سیاسی سطح پر ڈریفیوس کیس کے حوالے سے کئی بار ہنگامے ہوئے اور نقصِ امن پیدا ہوتا رہا!

ڈریفیوس کیس کو بھٹو کیس کے حوالے سے دیکھا جائے تو کئی المناک پہلو سامنے آتے ہیں اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ فرانس میں سب خامیوں کے باوجود اتنی معاشرتی لچک موجود تھی کہ لوگوں اور دانشوروں نے اس مسئلے کو زندہ رکھا۔ عوامی اور اجتماعی سطح پر ڈریفیوس کے حق اور مخالفت میں لوگ باہر نکلتے رہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ایک بے حسی ایک انتہائی مبالغہ آمیز خوش فہمی مسلط رہی۔ جبکہ مارشل لا حکومت نے بھٹو کو پھانسی دینے میں انتہائی غیر متوقع عجلت سے کام لیا۔

۲۴؍مارچ ۱۹۷۹ء کو سپریم کورٹ نے نظرِ ثانی کی درخواست مسترد کی۔ اب سات دن کا وقفہ رحم کی اپیل کے لیے تھا۔ ۳۱؍مارچ کو یہ مدت بھی ختم ہو گئی۔ اس دوران میں کوئی ادیب کوئی دانشور بھٹو کے لیے آواز بن کر سامنے نہ آیا۔ کسی نے انسانی زندگی کی قدروقیمت کا احساس نہ کیا۔ اور چار؍اپریل ۱۹۷۹ء کو صبح ہونے سے پہلے بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا! حکومت اس سے بھی زیادہ سرعت اور عجلت سے کام لینا چاہتی تھی اس کے ثبوت میں یہ تحریر پڑھیے!

”اُسے چار اپریل کو نہیں ۳؍اپریل کو پھانسی دی جا رہی تھی لیکن اُس کی زندگی میں ابھی ایک دن باقی تھا جو اُس سے کوئی چھین نہ سکا۔ بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر سے کہا گیا کہ وہ اپنے شوہر اور باپ سے آخری ملاقات کر لیں۔ لیکن انہوں نے علالت کا عذر کر دیا اور مقررہ دن یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ ملاقات کا نہ ہو سکنا بھی کوئی مجبوری نہ تھی۔ کیونکہ حکومت کا فرض صرف اتنا تھا کہ وہ ورثا کو آخری ملاقات کی دعوت دیدے۔ اگر کوئی ملاقات نہ کرنا چاہے تو مجبور کرنا حکومت کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اس میں مشکل یہ پیش آگئی کہ اس دن سندھ کا موسم خراب تھا اور طیارے کے لیے سفر اور مقررہ ہوائی اڈے پر اترنا بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس لیے پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ایک دن کے لیے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔“

(غیر سیاسی باتیں، عبدالقادر حسن۔ ہفت روزہ افریشیا شمارہ ۹، اپریل ۷۹، صفحہ ۷)

گویا حکومت کی راہ میں موسم رکاوٹ نہ بنتا تو وہ بھٹو کو ایک دن پہلے ہی پھانسی دیدیتی تھی۔ وہ لوگ جو بنی نوعِ انسان کے مزاج، نفسیات اور باطن کے نباض بنتے ہیں وہ حکومت کے طرزِ عمل کو نہ سمجھ سکے کہ وہ کس عجلت میں ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ وہ بھٹو کے لیے رحم کی اپیل کریں یا نہ کریں، بھٹو کو پھانسی نہیں دی جا سکتی

ع ببیں تفاوتِ راہ از کجا.......“

زولا کو جب انگلینڈ میں اطلاع ملی کہ ڈریفیوس کیس کی پھر سے سماعت ہونے والی ہے تو

سازشی
اور مجرم افسر
ملک سے
بھاگ گئے

پیرس واپس آگیا، حالانکہ اب بھی سزا اور جرمانے کی تلوار اُس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ لیکن وہ انصاف کے حصول کے لیے ڈٹا رہا۔ اُس نے جس تحریک کا آغاز کیا اور جس شخص کی حمایت میں جلاوطنی پر مجبور ہوا۔ اب پھر اُس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ فرانس میں ”League for The Defence of the Rights of man and citizen“ کی تشکیل ہو چکی تھی۔ بنی نوعِ انسان نے اپنے حقوق کے لیے ایک اور قدم آگے بڑھایا تھا۔

حالات اب بھی ڈریفیوس کے حق میں نہ تھے۔ فرانس کے صدر فارے کا انتقال ہوا نئے صدر کا انتخاب ہوا۔ نئی وزارت بنی۔ یوں ڈریفیوس کیس التوا کا شکار ہوتا رہا۔

بالآخر پھر ایک نئی فوجی عدالت نے نظرِ ثانی کی درخواست کی سماعت کی۔ انصاف ک نقاضے پورے ہو چکے تھے۔ لیکن فوج اور عوام شہریوں کے درمیان فرانس میں جو کشمکش پی ہو چکی تھی۔ وہ اس فیصلے میں رنگ لائی۔ اور اس عدالت نے بھی ڈریفیوس کو مجرم قرار دی حالانکہ میجر ہنری خودکشی کر چکا تھا۔ ساری سازش کا بھانڈہ پھوٹ چکا تھا

بعض اوقات

انسانی فیصلے

قانونی فیصلوں سے مختلف ہوتے ہیں

جس خط کی بنیاد پر اسے مجرم ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کا جعلی ہونا ثابت ہو چکا تھا بیاد بھی فوجی افسر۔ جو اصل مجرم تھے۔ ملک سے فرار ہو چکے تھے۔

اس کے باوجود ڈریفیوس کو مجرم قرار دیا گیا۔

اس کی عمر بھر کی جلاوطنی کی سزا کو منسوخ کر کے دس سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اسے فوج میں واپس لینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

اور پھر بھٹو کیس کو ذہن میں لائیے ......

فوجی عدالت سات منصفوں پر مشتمل تھی۔ پانچ نے ڈریفیوس کو مجرم قرار دیا اور دو منصفوں نے اسے بے گناہ قرار دیتے ہوئے اُس کی رہائی کی سفارش کی۔

جب یہ فیصلہ فرانس کے صدر بوبے کے پاس توثیق و تصدیق کے لیے پہنچا تو اُس کا فیصلہ جنرل ضیا الحق کے فیصلے سے مختلف تھا!

فرانس کے صدر بوبے نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت ڈریفیوس کی سزا معاف کر دی!

ڈریفیوس جسے اس مقدمے کی سماعت کی وجہ سے ڈیول آئیلینڈ سے پیرس پہنچا دیا گیا تھا۔ اُس نے صدر کے فیصلے کو تسلیم تو کر لیا لیکن وہ اپنی بے گناہی پر مصر تھا۔ وہ مجرم کی حیثیت سے زندہ رہنا یا مرنا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ عدالتوں کے فیصلے کچھ اور ہوتے ہیں اور انسانوں کے فیصلے کچھ اور۔

پاکستانی عدالتوں نے قانون کے مطابق بھٹو کو مجرم قرار دیا۔ لیکن بھٹو آخری دم تک اپنے آپ کو بے گناہ کہتا رہا۔

اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنے ماتھے سے ”جرم“ کا دھبہ دھونے کے لیے ڈریفیوس چین سے نہیں بیٹھا۔ ۱۹۰۴ء میں اُس نے نئی شہادتیں جمع کیں اور ایک سول عدالت میں اپنی بے گناہی کے لیے مقدمہ دائر کیا۔ عدالت نے ڈریفیوس کو بے گناہ تسلیم کیا۔

جولائی ۱۹۰۶ء میں یونائیٹڈ اپیل کورٹس نے اس کی معصومیت اور بے گناہی کی تصدیق کر دی۔

۲۲ جولائی ۱۹۰۶ء کو ڈریفیوس کو فوج میں اس کے عہدے (کیپٹن) پر بحال کر دیا گیا اور پھر اُسے لیجن آف آنر کا تمغہ بھی ملا۔ اُسے ترقی دے کر کچھ عرصے کے بعد میجر بنا دیا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں اُس نے لفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے جنگ میں حصہ لیا۔ ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو اُس کا انتقال ہوا ــــ!

عدالتوں نے اس کی زندگی کو بارہ برس تک ذہنی اذیتوں کی صلیب پر چڑھائے رکھا۔ لیکن وہ اپنی بے گناہی پر مصر رہا۔ زولا نے اس کی بے گناہی کے لیے جو تحریک شروع کی تھی وہ رنگ لائی۔

زولا کا انتقال ۲۹ ستمبر ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ ڈریفیوس اس کے جنازے میں شریک تھا۔

زولا نے اپنی زندگی میں جو آخری ناول مکمل کیا اس کا نام ”UERITE“ تھا اور وہ ڈریفیوس کیس کے گرد گھومتا ہے۔

زولا کو مرنے سے پہلے یقین تھا کہ ڈریفیوس بے گناہ اور بے قصور ہے ورنہ وہ ”UERITE“ نہ لکھتا!

جدید فرانس اور تھرڈ ری پبلک کی تاریخ پر ڈریفیوس کیس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ایک قوم نے اپنی غلطیوں حماقتوں اور قانونی پیچیدگیوں کا ازالہ کیا۔

آیئے بھٹو کیس کو بھی ذہن میں رکھ کر سوچیں

ہم اپنی اجتماعی حماقتوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کب کریں گے؟

کیا بھٹو کے مقدمے، اس کے انجام کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستانی قوم، اور اس کے دانشور، اپنی اجتماعی حماقتوں اور بے حسی کے ساتھ ساتھ قانونی غلطیوں کا کبھی ازالہ کر سکیں گے!

اس سوال کا جواب مستقبل دے گا!!

بھٹو تختہ دار پر
وہ ایک طوفان تھا۔ وہ تو گویا زندگی کا ہر لمحہ سولی پر لٹکا رہا
بھٹو مرحوم کی آپ بیتی
● مرتبہ: صہیب مرغوب۔ قیمت: چار روپے
مکتبہ شاہکار۔ کلفٹن کالونی۔ پوسٹ بکس ۱۷۵۴-لاہور

قاتل قابیل سے قاتل بھٹو تک

بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کی سازش کے بانی اور قاتل اور "بڑے مجرم" کی حیثیت سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ شہادتوں سے یہ ثابت ہوا کہ بھٹو احمد رضا قصوری سے تنگ آ چکا تھا۔ اور ایف ایس ایف اس کے عملے اور دیگر سرکاری اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جو نواب محمد احمد خاں کے قتل پر منتج ہوا۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ گولی جس سے احمد رضا قصوری کے والد ہلاک ہوئے وہ بھٹو کے ہاتھ سے چلی تھی۔ بھٹو موقع واردات پر موجود نہ تھے۔ ان قانونی موشگافیوں اور باریکیوں کی تفصیل میں جانے کا کوئی محل نہیں۔ کہ اگر جس شخص کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا اس کی بجائے کوئی دوسرا شخص قتل ہو جائے اور منصوبہ بنانے والا کوئی اور ہو اور منصوبے پر عمل کرنے والا کوئی اور، تو انسانی اور اخلاقی اقدار کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ یہ ایک بے حد نازک اور سنجیدہ مسئلہ ہے جس سے انسانی تقدیر وابستہ تھی۔ بھٹو کے مقدمے میں وکیل صفائی نے اس نکتے پر کیا نظائر اور دلائل پیش کئے۔ اور کس انداز میں پیش کئے اس پر بھی بحث کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ رائج الوقت قانون کے مطابق بھٹو کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور اس پر عمل بھی کرایا جا چکا ہے۔

لیکن انسانی سطح پر ایک سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا قاتل صرف قاتل ہوتا ہے؟ کیا وہ ایک انسان نہیں ہوتا؟ کیا اس نے اپنی زندگی میں تمام کام منفی اور بُرے ہی کئے ہوتے ہیں۔ ایک شخص جسے قانون قاتل قرار دے دے، کیا اس کے ایک فعل یعنی جرم قتل کے پردے میں اس کی تمام خوبیاں اور اچھائیاں بھی چھُپ جائیں گی؟ کیا کسی قاتل کے اخلاقی اور دوسرے اوصاف کو بھی اس کے اس ایک فعل کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جائے گا۔

یہ سوال اس وقت اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب قاتل بھٹو جیسا شخص ہو۔ انسانی تاریخ میں حضرت مسیح کو مصلوب کئے جانے کے واقع کو المناک ترین واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ جان سٹائن بیک نے اپنے ناول "تارٹیلا فلیٹ" میں اپنے ایک کردار کے حوالے سے ایک عجیب سوال پوچھا ہے۔ وہ کردار کہتا ہے۔

"وہ لوگ جنہوں نے مسیح کو سولی پر لٹکایا کیا ان کے دل رحم کے جذبے سے خالی تھے؟ کیا انہیں اپنی زندگیوں میں کبھی کسی پر رحم نہیں آیا تھا۔؟"

اگر آپ پوری انسانی زندگی اور انسان کے بنیادی احساسات کا تھوڑا سا شعور بھی رکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قاتل بھی انسانی جذبات اور احساسات سے عاری نہیں ہوتا۔

قاتل بھٹو بھی بنیادی انسانی احساسات اور جذبات سے خالی نہ تھا۔

اس سلسلے میں روئے زمین پر ہونے والے پہلے قتل، قاتل اور مقتول کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

خدا نے دنیا بنائی اور پھر انسان کو اپنی شبیہہ پر تخلیق کیا۔ شجر حیات کا پھل کھانے اور شیطان کے ورغلانے پر آدم و حوا باغ عدن سے زمین پر پھینک دیئے گئے اور پھر اس خاکی کرّے پر آدم و حوا کے یہاں پہلا بیٹا یعنی پہلی اولاد نے جنم لیا۔ پہلا خاکی اور زمینی انسان پیدا ہوا اور وہ کتاب مقدس کی زبان میں قائن تھا۔ جو حرف عام میں قابیل کہلاتا ہے۔ روئے زمین پر پیدا ہونے والا پہلا فرد قاتل تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا قتل کیا دیکھنا یہ ہے کہ خود خدا نے روئے زمین پر اس انسان کو کیا سزا دی جس نے ایک دوسرے انسان اور اپنے بھائی کا خون پہلی بار زمین پر بہایا تھا۔

کتاب مقدس کی پہلی کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔

جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ تب خداوند نے قائن سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے اس نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔ پھر اس نے کہا تُو نے یہ کیا کیا۔ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہے۔ جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے۔ جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ اب تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہو گا۔ تب قائن نے خداوند سے کہا کہ میری سزا برداشت سے باہر ہے۔ دیکھ آج تو نے مجھے روئے زمین سے نکال دیا ہے اور میں تیرے حضور سے روپوش ہو جاؤں گا اور زمین پر خانہ خراب اور آوارہ ہوں گا اور ایسا ہو گا جو کوئی مجھے پائے گا قتل کر ڈالے گا۔ تب خداوند نے اسے کہا نہیں! بلکہ جو قائن کو قتل کرے اس سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا۔ اور خداوند نے قائن کے لئے ایک نشان ٹھہرایا کہ کوئی اسے پا کر مار نہ ڈالے۔

یوں خدا نے پہلے قتل کو معاف کر دیا۔ اس لئے کہ قائن آدم کی پہلوٹھی کی اولاد تھی اور خدا قائن کے ذریعے بنی نوع انسان کی نسل کو آگے چلانا چاہتا تھا۔ خدا نے خود قائن کی حفاظت کی۔ اسے زندہ رکھا اسے نشان دیا اور یہ انتباہ کیا کہ جو قائن کو قتل کرے گا، اس سے سات گنا زیادہ بدلہ لیا جائے گا۔ کتاب مقدس میں اس کے بعد چلنے والی نسل کا شجرہ ملتا ہے۔ اور خدا نے قائن کی اولاد کو کئی خوشیوں سے نوازا۔!

حضرت موسیٰ کی شریعت اور دنیا کے تمام مذاہب نے قتل کے جرم کو سب سے گھناؤنا اور بھیانک جرم اور گناہ قرار دیا ہے۔ لیکن کسی مذہب نے بھی قاتل کی دوسری خوبیاں اور اوصاف کو نظر انداز کرنے کے بارے میں کوئی ہدایت یا کوئی حکم نہیں دیا۔ انسانی تاریخ میں ایسے ہزارہا واقعات ملتے ہیں۔ جن میں ملک قوم کے مفادات کے علاوہ، اقتدار کے تحفظ اور ذاتی انتقام کی بنا، ہزاروں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ دنیا کی تاریخ کے اوراق قتل و خون کی کہانیوں سے رنگین ہیں۔ لیکن تاریخ جہاں قتل و غارت گری کی داستانیں سناتی ہے، وہاں قاتلوں کے عظیم کارناموں اور کمالات کا بھی اعتراف کرتی ہے۔

قاتل ہونے کے باوجود کیا بھٹو نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ کیا وہ کسی کمال کا سزاوار نہ ہوا تھا؟

بھٹو کا انجام جو بھی ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ وہ ہماری تاریخ کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ اس کی زندگی کے آخری دو اڑھائی برس میں اس پر ہزاروں الزام عائد کئے گئے۔ اس کی ہر خوبی کو جھٹلایا گیا۔ اس کی ہر اچھائی کی مخالفت کی گئی۔ اسے درندہ، بھیڑیا اور سفاک ترین انسان بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بھٹو اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ایک لیجنڈ بن چکا ہے۔ ایک ایسی روایت جو زندہ اور تابندہ رہے گی۔

اپنے مخالفوں کو راہ سے ہٹانے کی، قتل کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ کسی ملک کی تاریخ کا کوئی دور اُٹھا کر دیکھ لیں۔ ایسی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ پاک و ہند کی تاریخ کو لے لیجئے۔ اسلام کی تاریخ کو لے لیجئے۔ مخالفوں کو، اقتدار کی راہ میں کھڑی رکاوٹوں کو، دُور کرنے کے لئے ہر دور میں قتل کیا گیا۔ اُمویوں، عباسیوں، عثمانیوں، فاطمیوں اور برصغیر

میں خلجیوں، تغلقوں اور مغلوں کے ادوار کا سرسری سا بھی مطالعہ کیا جائے تو بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ شاہجہان کو مغلیہ دور کا سب سے رحم دل اور شاعر کا دل رکھنے والا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اقبال نے اورنگ زیب عالمگیر کو خراج پیش کرتے ہوئے ـــــ وہ اسلام کے ترکش کا آخری تیر کہا۔ لیکن اورنگ زیب نے اقتدار کے حصول کے لئے بھائیوں کا جس طرح صفایا کیا، اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھرائیں اور بوڑھے باپ کو قید میں رکھا، یہ سب کچھ ہمیں تاریخ بتاتی ہے۔ اس کے باوجود اورنگ زیب عظیم ہے۔ اس کی عظمتوں اور اس کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تو کیا نواب محمد احمد خاں کے قاتل بھٹو کی خوبیوں اور عظمتوں سے انکار کر دیا جائے گا؟

اگر شاہ جہان اور عالمگیر اپنی تمام بشری خامیوں اور اخلاقی جرائم کے باوجود اپنی عظمتوں، خوبیوں اور خدمتوں کی وجہ سے عظیم تسلیم کئے جاتے ہیں تو کیا بھٹو کو عظیم تسلیم کرنے میں کوئی خاص مصلحت یا رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔

تاریخ انصاف مانگتی ہے اور تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے والے وقتی اور عارضی طور پر شاید کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ دائمی کامیابی اُن کا مقدر نہیں بن سکتی!

بھٹو اس ملک کا ایک سیاست دان تھا۔ عوام نے اُس پر اعتماد کیا تھا۔ بھٹو سے اس کا یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ وہ اس ملک کا پہلا منتخب وزیر اعظم تھا۔ بھٹو نے عوام میں جو سیاسی شعور پیدا کیا اس کے اس اعزاز کو بھی کوئی نہیں چھین سکتا۔ نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ڈرائینگ روموں میں جنم لینے والی سیاست کو اس نے کھیتوں، کارخانوں کسانوں، مزدوروں، غریبوں اور پچھلے طبقوں تک پہنچا دیا۔ اس نے پہلی بار اس ملک کی سیاست میں انقلاب پیدا کیا۔ اس نے پہلی بار غریبوں اور پچھلے ہوئے طبقوں کو سر اُٹھا کر چلنا سکھایا۔ اس نے اس ملک میں پہلی بار عوام کو ان کی قسمتوں اور مقدر کا مالک بنایا۔ بھٹو نے عوام کی تقدیر کو ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس نے صدیوں سے چپ اور گم زبانوں کو قوتِ گویائی بخشی۔ اس نے عوام کو یہ ہمت اور صلاحیت دی کہ وہ اپنا حق مانگ سکیں۔

بھٹو بُرا تھا، قاتل تھا، آمر تھا، فیوڈل لارڈ تھا۔ جو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک خود کو ڈی کلاس نہ کر سکا۔ اس نے اپنے عہدِ اقتدار میں بہت غلطیاں کیں۔ بڑے ظلم کئے۔ وہ غلطیوں اور جرائم کا مجموعہ یا پلندہ تھا۔ اور شاید اس پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہ شعار صادق آتے ہیں۔

I see more - and more clearly,
The many many mistakhe I have made,
My whole life through, mistakes upon mistakes
The mistaken attempts to correct mistakes,
By method which proved to be regularly mistaken

ہاں شاید اس نے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے لئے بھی غلطیاں کیں۔ وہ غلط کار تھا۔ آپ اُسے جو چاہے کہیں، جیسا الزام چاہے، اُس پہ تھوپ دیں۔ جیسا طوق چاہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود یہ آپ، اور ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ

بھٹو ایک شیطان تھا انسان نہیں۔

بھٹو اس ملک کا پہلا منتخب وزیر اعظم نہیں تھا۔

بھٹو نے اس ملک کے عوام کو نیا سیاسی تصور نہیں دیا۔

بھٹو نے پاکستان کو اس وقت سنبھالا نہیں دیا جب ملک دولخت ہو چکا تھا اور ہماری کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔

آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ـــــ

بھٹو نے نوے ہزار جنگی قیدیوں کو باعزت طور پر رہا نہیں کروایا تھا۔

آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بھٹو نے دشمن کے قبضے سے ملک کے ایک حصّے کو واپس نہیں لیا تھا۔

اس حقیقت سے کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا کہ بھٹو نے پاکستان میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کرا کے اسلامی یکجہتی کے لئے عظیم کوشش نہیں کی تھی۔

اس لئے کون انکار کر سکتا ہے کہ بھٹو نے تقریباً ایک صدی پرانے فتنے کو ختم نہیں کیا اور ختمِ نبوت کا مسئلہ عملی طور پہ پہلی بار قادیانیوں کو غیر مسلم اور اقلیت قرار دے کر ختم نہیں کر دیا تھا۔ بھٹو کے کٹر ترین مخالف شورش کاشمیری نے بھٹو کے اس کارنامے پر اسے مبارکباد دی تھی۔ آپ اور ہم سب مل کر شورش کاشمیری کے کلام سے وہ نظم حذف نہیں کر سکتے جو شورش مرحوم نے بھٹو کے اس کارنامے پر بھٹو کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھی تھی۔

اس ملک کا کوئی باشعور انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بھٹو سرمایہ داری سامراج، استحصال، غلامی اور نوآبادیاتی نظام کا دشمن تھا۔

بھٹو کے کردار کی اس خوبی اور عظمت سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ کہ اس نے عالمی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ اُسے فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی کا پُرجوش، باعمل اور سچا ترجمان تسلیم کیا گیا۔

اور اس حقیقت سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ "قاتل بھٹو نے عالم اسلام کو قریب تر لانے، متحد کرنے کی بھرپور کوشش نہیں کی۔

بھٹو نے پاکستان کو عالمی برادری میں ایک نیا مقام بخشا۔

بھٹو نے خارجہ پالیسی میں ایسی دوررس نتائج کی حامل تبدیلیاں کیں اور پاکستان کے لئے ایسے دوست اور ہمدرد ملک تلاش کئے اور ان کے ساتھ ایسے تعلقات کی بنیاد رکھی جو دائمی رشتوں کی صورت اختیار کر گئے۔ ایک ہم ان ملکوں اور رشتوں پر ہمیشہ اعتماد کر سکتے ہیں۔

بھٹو نے اپنی زندگی میں بڑی بڑی طاقتوں کو بلا خوف و خطر للکار کر جرأت سچائی اور حق گوئی کی جو روایت قائم کی اُسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

بھٹو نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے لئے بڑے بڑے ملکوں کی مخالفت مول لی۔ اور اپنے موقف اور پاکستان کی برتری اور سربلندی کے لئے آخری لمحوں تک ڈٹا رہا۔

بھٹو نے ملک میں پہلی بار انقلابی تبدیلیاں کیں۔ نیشنلائزیشن کا سہرا بھی اس کے سر بندھتا ہے۔

اس نے پاکستانی معیشت کو ایک نیا اور انقلابی رُخ دینے کی کوشش کی۔

بھٹو تیسری دنیا کے ممالک اور عوام کے لئے عظیم خدمات سرانجام دینے کے لئے کوشاں تھا۔

تیسری دنیا کی قوت اور اتحاد کے لئے اس نے بہت کچھ کرنا تھا۔ تیسری دنیا کے عوام اور عالمِ اسلام کو بھٹو کے ساتھ بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

لیکن وہ قاتل تھا۔ قتل کے جرم میں اسے پھانسی پہ لٹکایا گیا۔ سب درست، بجا تسلیم لیکن بھٹو کی خدمات اس کے کارناموں اور عظمتوں کو کوئی پھانسی پہ لٹکا نہیں سکتا۔ کوئی انہیں ملیامیٹ نہیں کر سکتا اور اس حوالے سے بھٹو ایک تابندہ روایت ایک تحریک ایک استعارہ اور ایک لیجنڈ کی حیثیت سے کبھی نہ بھلایا جائے گا۔

ہر اس عظیم انسان کی طرح جو متعصب اور تنگ نظر دنیا میں نیا خیال نئی سوچ نیا اندازِ فکر نئی ایجاد لے کر آیا۔ اس نے اپنے عہد میں اپنی سوچ اپنی ایجاد اور اپنی روشنی طبع کی وجہ سے ذلت اٹھائی، معتوب ٹھہرا، اذیتیں برداشت کیں۔ اور پھر وقت گزرنے کے بعد عظیم امر اور لازوال ہوا۔ بھٹو بھی اسی روایت کی ایک کڑی تھا۔ قابیل سے بھٹو تک بہت قاتل پیدا ہوئے تھے۔ ان گنت لاتعداد۔ لیکن ہر قاتل انسان ہونے کے باوجود بھٹو نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر انسان تحریک نہیں ہوتا۔ کسی عظیم روایت کا حصّہ نہیں ہوتا۔ جب کہ بھٹو صرف قاتل نہ تھا عظیم انسانی روایت کی ایک عظیم کڑی تھا۔!

* * *

"وائٹ پیپرز"

دنیا کے کسی مذہب، کسی ضابطۂ اخلاق اور مہذّب قانون نے کسی کو یہ اجازت نہیں دی۔ کہ جب کسی پر الزام لگایا جائے تو اُسے جواب کا حق نہ دیا جائے۔ اگر صرف الزام لگا کر دوسرے کو جواب کا موقع نہ دیا جائے تو اس طرح ایک شخص کی بنیادی آزادی اور حق کو ہی غصب نہیں کیا جاتا بلکہ انصاف کا بھی خون کر دیا جاتا ہے۔ آرتھر ملر نے تو مثالی معاشرہ ہی اسے قرار دیا تھا۔ جہاں الزام لگانے اور اس کا جواب دینے کی آزادی حاصل ہو—— موجودہ مارشل لا حکومت نے بھٹو کی زندگی میں۔ ہزاروں صفحات اور کئی جلدوں پر مشتمل قرطاس ابیض لاکھوں روپے کے اخراجات سے شائع کیے۔ بھٹو اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ معاملہ سپریم کورٹ میں بھی اٹھایا گیا۔ حتیٰ کہ بھٹو کے سینئر وکیل کے حوالے سے بھٹو کا جواب لاہور کے ایک پریس میں بھی چھپ رہا تھا کہ پریس کیپرز کو پکڑ لیا گیا۔ اور ہر طرح سے کوشش کی گئی کہ بھٹو الزامات کا جواب نہ دے سکیں۔ اور تصویر کا دوسرا رُخ سامنے نہ آسکے۔ یوں بھٹو کو ان کے اس بنیادی حق سے محروم رکھا گیا اور تاریخی اعتبار سے بھٹو کے جواب کی عدم موجودگی میں۔ جو خلا پیدا ہوا۔ اور حقائق کو جس طرح دبایا گیا۔ وہ ایک اہم تاریخی اور دستاویزی غلطی کے مترادف ہے۔ ہم اپنی طرف سے۔ بھٹو اور اس کے عہدِ حکومت کے بارے میں شائع ہونے والے فوجی حکومت کے وائٹ پیپرز پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ان وائٹ پیپرز کا تجزیہ کرنا مشکل نہ تھا۔ لیکن ان کا جو جواب خود بھٹو دے سکتے تھے وہ کسی کے بس میں نہیں۔ اس لیے ہم بھی اس باب میں پیپر کو "وائٹ" چھوڑتے ہیں!

چھاج اور چھلنی کی حکایت

ڈاکٹر جانسن نے سوئفٹ پہ طنز کیا تھا۔ کہ وہ استعارے سے ڈرتا ہے!

جانتھن سوئفٹ نے ،،گلیورز ٹریولز،، لکھ کر ثابت کیا کہ انسان کو اپنے آس پاس کی دنیا اور اپنی ذات کا شعور حاصل ہو۔ اور لکھنے والا خارجی عوامل اور اندرونی کشمکش میں توازن پیدا کر سکے تو وہ استعارہ تخلیق کر سکتا ہے۔

ادھر اپنے محمد حسن عسکری صاحب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ہمارے لکھنے والے استعارے سے خوف کھاتے ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ ہمارے ہاں واقعی استعارے سے خوف کھایا جاتا ہے۔ اور اسے تخلیقی ادب سے کچھ باہر کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ استعارہ ہی دراصل تخلیقی ادب ہوتا ہے۔

بھٹو کو اپنی زندگی میں جن سیاستدانوں اور لوگوں سے پالا پڑا۔ میں جب ان کا تصوّر کرتا ہوں اور ان کے چہرے آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ تو بے اختیار ہونٹوں پہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ ایک تو بھٹو کے اپنے تضادات سے۔ اس پہ مستزاد —— اس کی روشنیٔ طبع۔ جو بالآخر ،،براو بلا شدی،، ہوئی۔ اور پھر وہ لوگ — جن کا اس سے ساری عمر سابقہ رہا۔

،،گلیورز ٹریولز،، مزے کی حکایت اور مزاح ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ سوئفٹ نے اپنے دور کے سیاستدانوں اور سیاست پہ اس کتاب کے حوالے سے کتنی بڑی طنز کی تھی۔ اب بھی اگر بھٹو اور اس کے ہم عصر سیاستدانوں کی کوئی کہانی —۔ اسی پیرائے میں لکھے۔ اور استعارے سے خوف نہ کھائے تو بھٹو اور اس کے ہم عصر سیاستدانوں کے حوالے سے۔ ،،گلیورز ٹریولز،، جیسی نہ سہی۔ لیکن اس طرح کی ایک سچی اور پُر مزاح اور دلچسپ طنزیہ کتاب ضرور لکھی جاتی ہے۔

اپنی زندگی میں بھی۔ اور اب اپنی موت کے بعد بھی۔ بھٹو —— ان ،،للی پٹنز،، سیاستدانوں کے سامنے —— ،،گلیور،، کی طرح کھڑا ہے۔ یہ سب اُن کے سامنے بونے، پستہ قامت اور بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔

اور بھٹو کا قد اب بھی ان سے بڑا نظر آتا ہے۔

اور یہ صرف قد اور بلندی کی بات نہیں۔ اور اپنے ہاں کے سیاستدانوں کا لوگوں اور عوام پہ اثرات کا تنقیدی اور بے لاگ جائزہ لیں تو یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ بھٹو کی سیاست کے جتنے دوررس اثرات ہماری سیاسی زندگی اور تاریخ پہ مرتب ہوئے۔ اور جس طرح بھٹو کی ذات اور شخصیت نے عوام کو ہمہ گیر سطح پہ متاثر کیا۔ اس طرح کوئی سیاستدان عوام کو متاثر نہ کر سکا۔ اور اب جب کہ وہ مر چکا ہے۔ اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہے۔ تب بھی وہ اپنی سیاست اور عوام پہ اپنے گہرے اور دوررس اثرات کی وجہ سے زندہ ہے۔

بھٹو اس اعتبار سے بھی خوش قسمت تھا کہ اپنی زندگی میں اُسے ہر طرح کا الزام سننا پڑا۔ اس کے مخالفوں نے اس کی دھجیاں بکھیرنے کی مہم مسلسل جاری رکھی تھی۔

اور بھٹو اس اعتبار سے بھی خوش قسمت ہے کہ مرنے کے بعد اس کی ،،خلاصی،، نہیں ہوئی اور دشنام و رسوائی کا بازار اس کے لئے گرم ہے۔ اور اس کے مخالف اب بھی اس سے اسی طرح خائف ہیں۔ جس طرح اس کی زندگی میں اس سے خوفزدہ تھے۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے دلائی لامہ کی حکایات کا وہ شخص بھٹو ہی تھا۔ جس پہ دلائی لامہ اپنا غصّہ نکالا کرتا تھا۔

دلائی لامہ کی وہ حکایت کچھ یوں ہے۔ کہ دلائی لامہ نے ایک خاص ملازم اپنے خاص مقاصد کے لئے رکھا ہوا تھا۔ دلائی لامہ جیسا کہ اس کے لقب اور نام سے ظاہر ہے۔ مقدّس انسان سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور دنیا میں لاکھوں انسان اس کے پیروکار رہے ہیں۔ اور اُسے —— RE-INCATED GOD - کی صدیوں سے حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن دلائی لامہ بھی بہرحال —— انسان ہوتا ہے۔ وہ خاص دلائی لامہ جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ بڑا سیانا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ دلائی لامہ کو سیانا اور زیرک ہونا بھی چاہیئے۔ یہ دلائی لامہ سارا دن اپنا غصّہ، اپنی نفرت اپنی بشری خامیوں کو چھپائے رکھتا۔ اور

لوگوں کے سامنے دیوتا اور خدا، کا روپ دھارے رہتا۔ یہ اپنا مقدس امیج برقرار رکھنے کی ایک عیارانہ یا انتہائی دانشمندانہ کوشش ہوتی تھی۔ لیکن جونہی وہ لوگوں کی موجودگی سے فارغ ہوتا۔ اپنے اس ملازم خاص پہ برس پڑتا۔ اور سارے دن کا غصہ، نفرت اور خفگی کا اظہار اس پہ کرتا۔ اس پہ مغلظات کی بارش کر دیتا۔ نفرتوں کے تھوک سے اس کو لتھیڑ دیتا۔ یوں وہ ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ اور جب پھر لوگوں کے سامنے جاتا تو خدا اور مقدس دیوتا بن جاتا۔

یہی حال ہمارے عہد کے سیاستدانوں کا تھا۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنے مقدس چہرے اور ''مقدس اعمال نامے'' لئے حاضر ہوتے۔ مذہب، اخلاق، رواداری، اسلام کے اعلیٰ اصول، شرافت، تہذیب اور روحانی اقدار کا پرچار کرتے۔ لیکن جونہی بھٹو کا ذکر ہوتا۔ یا انہیں بھٹو کا ذکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ تقدس، رواداری، اخلاقی اقدار، شرافت، تہذیب اور اپنی اپنی روحانیت کو نظرانداز کر کے —— وہ زبان استعمال کرنے لگے۔ جو زبان دلائی لامہ —— اپنے ملازمِ خاص کے لئے استعمال کرتا تھا۔

کس سیاستدان نے بھٹو کو گالی نہیں دی۔ کس نے اس کے اخلاق اور کردار میں کیڑے نہیں نکالے۔

ایسا کوئی سیاستدان نہیں جس نے بھٹو کی مخالفت نہ کی ہو۔ اور یہ مخالفت بیشتر صورتوں میں محض مخالفت برائے مخالفت ہوا کرتی تھی۔ یہ مخالفت اس خوف کی پیداوار تھی۔ جو انہیں بھٹو سے محسوس ہوتا تھا۔ یہ مخالفت بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سے تھی۔ بھٹو کے عہد کے ہر سیاستدان نے اس کی ذات اور اس کی سیاست میں کیڑے نکالے۔ اور تو اور —— یہ وقت بھی بھٹو پہ ہی آیا۔ کہ وہ لوگ جن کو بھٹو اور پیپلز پارٹی نے بنایا تھا۔ جب وہ کسی وجہ سے پیپلز پارٹی اور بھٹو کو چھوڑنے پہ ''مجبور'' ہوئے۔ تو وہ بھی بھٹو پہ اُسی زبان اور اُسی لہجے میں گرجے اور برسے۔ جس طرح مخالف برستے اور گرجتے تھے۔ انہوں نے بھی بھٹو پہ کیچڑ اچھالا۔ اور اس کی ''کلاسیکی مثال'' پنجاب کے اس وزیر اعلیٰ کی ہے۔ جو بھٹو کے دور میں پنجاب کا پہلا وزیر خزانہ رہا۔ پھر وزیر اعلیٰ اور پھر سینیٹ کا رکن۔ جب یہ صاحب بھی اپنے ''آقا'' سے بگڑے تو انہوں نے اپنے ایک زرخرید اخبار میں بیگم نصرت بھٹو کی ایک تصویر شائع کرائی۔ جس میں وہ امریکہ کے سابق صدر مسٹر فورڈ کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔

اور اس تصویر کی اشاعت پہ ان کے بغل بچے اخبار، اور خود انہوں نے بڑی بغلیں بجائیں۔ اور اتنے مزے لئے کہ اس تصویر کو ایک روز اور ایک بار چھاپ کر بھی ان کی سیری نہ ہوئی اور اسے دوسرے روز دوبارہ چھاپا گیا۔ حالانکہ وہ تصویر ایک معمولی تصویر تھی۔ اور ایسی تصویریں سربراہانِ مملکت اور ان کی بیگموں کی شائع ہوا کرتی ہیں۔ کہ جب کوئی سربراہ مملکت دوسرے ملک کے سرکاری دورے پر جاتا ہے تو اُسے وہاں کے آداب و معاشرے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وائٹ ہاؤس میں رقص کی محفل ہوئی اور رقص مغرب میں عام بات ہے۔ اور وہاں وائٹ ہاؤس میں آداب کے مطابق امریکی صدر نے غیر ملکی سربراہ کی بیگم کے ساتھ رقص کیا۔ یہ سراسر سفارتی اور غیر ملکی آداب کے تحت تھا۔ لیکن اس اخبار نے ایسی سرخی جمائی کہ ہر وہ شخص جسے ذرا سی بھی سوجھ بوجھ عطا ہوئی تھی۔ اُس نے اس کی مذمت کی۔ ویسے ان جیسے صاحبان کی بڑی خواہش رہی کہ وہ وزیر اعظم بنیں۔ فرض کیجئے۔ اگر وہ کسی غیر ملکی دورے پر جاتے اور وہاں سرکاری طور پہ محفل رقص ہوتی تو کیا ان کی بیگم رقص سے انکار کر دیتی۔ اور پھر طرہ یہ کہ یہ تصویر جس کی شہ پہ شائع ہوئی۔ وہ صحافی بھی ہیں۔ مصوّر بھی اور ادیب و مدیر بھی۔

حقیقت کے اظہار کے لئے یہ ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ جب کہ صورتِ حال یہ تھی کہ بھٹو کو ہر شخص نے کوسا اور اُسے گالی دی تھی۔ اپنوں نے بھی جب وہ بیگانے بنے اور بیگانوں نے بھی۔ کہ وہ تو خیر روزِ اوّل سے ہی اس سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ اصل میں جو گالی بھٹو کو دی گئی۔ وہ بھٹو کو نہیں۔ ایک نئے عہد کی آمد ایک نئے طرزِ سیاست اور ان عوام کو دی گئی تھی۔ جنہوں نے بھٹو کو قائدِ عوام بنایا تھا۔

بھٹو میں بھی اُس حسِ ظرافت کی کمی نہ تھی۔ جو سعادت حسن منٹو کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

منٹو نے اپنی کتاب اور اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منٹو کے افسانے'' ''ایڈیٹر دین و دنیا'' کے نام معنون کی تھی۔ اور اس جملے کے ساتھ معنون کی تھی۔

''جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں''

بھٹو بھی اپنے ہم عصروں پر جملے اچھالتے رہتے تھے اور اپنے مخالفوں کی بوالعجبیوں اور بغضِ بھٹو سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان کے کتنے ہی بیان اور تقریریں ان کی حسِ ظرافت کو سامنے لاتے ہیں۔

اصل میں یہ سب چھلنیاں تھیں۔ جو چھاج پہ برستی رہتی ہیں۔ بھٹو بھی انسان تھے۔ اور ان میں انسانی اور بشری خامیاں موجود تھیں۔ وہ فرشتہ نہ تھے۔ آدمی تھے۔ ان میں خامیاں بھی تھیں اور خوبیاں بھی۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو تاریخ کا طالب علم کہتے تھے۔ عالم اور مذہبی رہنمائی کا دعویٰ انہوں نے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ خوش ذوق آدمی تھے۔ اور ان کی جمال پرستی بھی انسانی خوبیوں میں ہی شامل ہوتی ہے۔ کہ خوبصورتی سے پیار کرنا۔ انسانی مزاج کا بھی ایک فطری اور ناگزیر حصہ ہے۔ وہ اپنے طبقے اور زمانے کے تضادات کا بھی شکار تھے۔ لیکن روشنیٔ طبع سے محروم نہ تھے۔ یوں ان میں —— بغیر کسی معذرت کے، کہا جا سکتا ہے کہ —— منافقت کا عنصر کم تھا۔ ان کے مقابلے میں ان کے عہد کے سیاستدانوں میں منافقت کا عنصر بڑا فراوانی نظر آتا ہے۔ بھٹو کو نشانہ بنا کر یہ لوگ اپنے اپنے تعصبات اپنی اپنی تنگ نظری اور رجعت پسندی کا اظہار کرتے تھے۔ اگر موازانہ کیا جائے تو —— ان کی حیثیت اس چھلنی کی سی بنتی ہے۔ جس میں سینکڑوں چھید اور سوراخ ہوتے ہیں۔ اور یہ چھلنیاں اتنی ڈھیٹ بھی تھیں (اور ہیں) کہ وہ چھاج کے منہ لگتی تھیں۔

ویسے یہ مطالعہ اپنی جگہ بڑا درست ہے کہ بھٹو کے مخالف کیا کہتے تھے۔ اس پر کس طرح کی الزام تراشی کرتے تھے۔ اور ان کی الزام تراشی کی حقیقت کیا تھی اور خود الزام لگانے والے کس پائے کے آدمی تھے۔

بھٹو پر ایک الزام یہ بھی لگا۔ کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو نہیں۔ گھاسی رام ہے۔ مسلمان نہیں۔ ہندو ہے۔ اس کی ماں —— ہندنی تھی۔ اس کے ماموں کے انٹرویوز بھی شائع کئے گئے۔

اسلام پسند پریس نے اس شجرہ نسب کو خوب اچھالا، اور اس کی بڑی تشہیر کی۔ یہ بھٹو کی مخالفت کی انتہا تھی۔ اس سے زیادہ کم ظرفی اور رکیکگی کا اظہار پڑھے لکھے لوگوں اور اسلام سے تعلق رکھنے والے اور اسلام کی ابتدائی تعلیمات کو جاننے والے لوگوں کی طرف سے کبھی نہیں ہوا۔ اپنے نظریاتی یا سیاسی مخالف پر اس طرح کی گھٹیا الزام تراشی کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔

فرض کیجئے کہ بھٹو کی والدہ ہندو بھی تھیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بعد میں وہ مسلمان ہوئیں۔ ان کا اسلامی نام رکھا گیا۔ اور وہ مسلمان شوہر کی بیگم بنیں، اور انہوں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ جس کا نام ذوالفقار علی رکھا گیا۔ جو سراسر اسلامی نام ہے۔

کیا اسلام میں احترامِ آدمیت کی یہی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کا مظاہرہ بھٹو کے مخالفوں نے کیا۔

کیا اسلام میں نومسلموں کی اسی طرح تذلیل اور مٹی پلید کی جاتی ہے۔ جس طرح سے ان لوگوں نے ایک نومسلم خاتون کے ساتھ سلوک کیا؟ کیا اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر یہ لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ کہ خود ان میں سے اسی فیصدی مسلمانوں کے آباؤ اجداد —— غیر مسلم تھے۔ اور انہوں نے خدا کے آخری دین کو لبیک کہا۔ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوئے اور پاکستان کی سرزمین اور پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے والے اسّی فیصد سے زیادہ مسلمانوں کے آباؤ اجداد اس خطۂ زمین کے پرانے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔

اور یہ کہ جہاں قرآن پاک میں ''لا اکراہ فی الدین'' کا واضح حکم ہے۔ وہاں مسلمانوں پر

یہ فرض بھی ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب کی اشاعت کریں اور خدا کا پیغام دین اور مذہب تمام انسانوں تک پہنچائیں۔ اور یہی فریضہ تھا۔ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کیا۔ اور دوسرے اولیائے کرام اور بزرگان دین کی زندگی کا مقصد وحید ہوا۔

کیا یہ شیوہ مسلمانوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو غیر مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوں اور مرتد بھی نہ ہوئے ہوں۔ کیا یہ اسلامی رواداری، فراخدلی اور مساوات کی توہین و تکذیب نہیں۔ کہ اس طرح کسی کی شخصیت کو مسخ کیا جائے۔ اور زندہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مردہ انسانوں کے مذہب و عقائد پر بھی کیچڑ اچھالا جائے۔ اور عورتوں کو رسوا کیا جائے؟

لیکن اسلام کے علمبرداروں، اسلام کے نام لیواؤں اور مذہبی رہنماؤں اور ان کے اسلام پسند جرائد نے یہ کام کر دکھایا۔ اور تمام اسلامی اور اخلاقی اور انسانی اقدار کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

وہ شخص جس نے اس ملک کو متفقہ آئین دیا۔ جس آئین میں یہ شق ہے کہ کوئی غیر مسلم —— اس حکومت اور پاکستان کا صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ اس کے بارے میں یہ غلاظت پھیلانے والوں نے یہ نہ سوچا کہ وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ اپنے مذہب کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔

معافی کے ساتھ — یہ حقیقت سامنے لانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہ یہ لوگ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے شجرہ نسب چھاپ کر بھی وہی کچھ لکھ سکتے ہیں۔ جو انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں لکھا۔ جب کہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے شجرہ ہائے نسب سے بھی یہ حقیقت سامنے آ جائے گی۔ کہ اسلام کے یہ عظیم فرزند، پاکستان کے خالق اور بانی کے آباؤ اجداد بھی چند نسلیں پہلے کلمہ گو اور مسلمان نہ تھے!!

وہ بھٹو —— جو فرقہ واریت اور مذہبی فرقوں اور متصادم عقیدوں میں یقین نہیں رکھتا تھا اور اپنے آپ کو ایک سیدھا سادہ مسلمان کہتا تھا۔ اس پر یہ الزام ان لوگوں کی طرف سے ہی لگائے گئے۔ جو خود مختلف مذہبی فرقوں اور عقیدوں سے وابستہ ہیں۔

بھٹو کو ایک زمانے میں کافر بھی قرار دیا گیا۔ اس کے خلاف کفر کے فتوے عام ہوئے تھے۔

کسی کو کافر قرار دینا ہم مسلمانوں کے لئے زیادہ مشکل کام کبھی نہیں رہا۔ آخر یہی علمائے کرام اور رہنما علمائے کرام کے مختلف سلسلے اور فرقے تھے۔ جنہوں نے علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ کو کافر قرار دیا تھا۔ اور قائداعظمؒ کو کافراعظم، کہنے والے بھی تو عرصے تک... اس ملک میں دندناتے رہے ہیں۔ اور ان کو نام کے مسلمان کہنے والے تو آج بھی محترم ہیں۔ جن مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں بھی حصّہ نہ لیا تھا۔ بلکہ مولانا مودودی صاحب نے برصغیر کے تمام مسلمانوں (تقریباً ننانوے فیصد کہہ لیجئے) کو نام کے بے عمل مسلمان اور مسلمانوں سے بدتر قرار دیا تھا۔

کفر و تکفیر کی یہ رسم بڑی پرانی ہے۔ یہاں منصور حلاجؒ بھی ملتے ہیں۔ اور سرمدؒ بھی۔ اور پھر بھٹو —— ان بیشتر لوگوں سے بڑے، عظیم اور مقدس نہ تھے۔ جن پر علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔

بھٹو اس لئے ان چھلنیوں کے مقابلے میں چھا رہے ہیں کہ وہ تو روحانی بلندیوں اور مذہبی عظمتوں کا دعویٰ ہی نہ کرتے تھے۔

بھٹو پر جو الزام تھے۔ ان میں ان کو شرابی، بدکار اور جانے کیا کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ اب شرابیوں اور بدکاروں کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہمارے موضوع اور حیثیت سے باہر ہے۔ کیونکہ —— جس طرح کے شرابی اور بدکار، بھٹو تھے۔ اس طرح کے شرابیوں اور بدکاروں میں نہ صرف اپنے ہاں کے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے انسانی تاریخ کو نئی صورت دی۔ جو تاریخ ساز اور اپنے عہد کے معمار تھے۔ پھر اس سلسلے میں ہم اس لئے بھی کچھ نہ کہیں گے۔ کہ بھٹو پر الزام لگانے والوں پر ہم کوئی الزام لگائیں گے۔ کہ یہ ہمارے نزدیک کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے۔ ہاں صرف اتنا کہیں گے کہ اخلاقی برائیوں سے یہاں کس کا دامن پاک ہے۔ اور پھر یہ شیخ و زاہد و مفتی۔ جب خلوت میں جاتے ہیں تو —— کیا کرتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ ہی کافی ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ہاں —— بے عیب ذات اللہ کی ہے!

بھٹو تو ایک آدمی تھا۔ اور آدمی —— بشری خامیوں سے کب پاک ہوئے ہیں۔

بھٹو کے خلاف کہا جاتا ہے۔ اور یہ الزام بڑا اہم ہے۔ کہ اس نے پاکستان کو توڑا۔ یہ الزام ایسے لوگوں کی طرف سے بھی عائد ہوا ہے۔ جنہوں نے تحریک پاکستان، قائداعظمؒ اور قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اور اب بھی ان کے دل کہیں اور اٹکے ہوئے ہیں۔ بھٹو پر یہ الزام لگانے والے کاش —— حمود الرحمٰن رپورٹ کو ہی کبھی چھاپ دیتے۔ تاکہ یہ تو پتہ چل جاتا کہ پاکستان کو دولخت کرنے میں بھٹو کا کتنا ہاتھ ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی۔ اور وہ لوگ جن کی سرگرمیوں کو ملک کی سلامتی اور ملک کے خلاف قرار دیا گیا۔ اور سپریم کورٹ نے اپنے ریفرنس میں ان کو پاکستان دشمن قرار دیا۔ ان کے خلاف تو کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا؟

وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کے نظریئے کی بنیادی مخالفت پر ہمیشہ اپنے آپ کو وقف کئے رکھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد بھی وہ پاکستان کی جڑیں کاٹنے کی فکر میں رہے۔ ان لوگوں اور سیاسی رہنماؤں نے بھٹو پر الزام لگا کر گویا اپنی سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں وہ مصروف رہیں گے۔

یہ تو وہ لوگ ہیں۔ کہ جو جمہوریت کے چیمپئن بنتے ہیں۔ اور بھٹو کو آمر اور ڈکٹیٹر کہتے رہے۔ اور جانے کب تک کہتے رہیں گے۔ لیکن خود ان کا حال یہ تھا۔ کہ انہوں نے کبھی اکثریت کے فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ اور ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہوں نے بھٹو کو ووٹ دینے والوں کو بھی مردود اور بھٹکے ہوئے قرار دیا۔ اور پھر یہ بات تو ان لوگوں کے لئے کہنا بڑا ہی آسان ہے، کہ — ایسے لوگوں کی غلطیوں کی وجہ سے عذاب الٰہی نازل ہوگا۔

یعنی جمہوریت کا راگ بھی یہ چھلنیاں گائیں گی اور جمہوری فیصلے کو بھی کبھی تسلیم نہ کریں گی اور جب مارشل لا لگے گا اُسے سیلوٹ بھی کرنے والوں میں یہ سب سے آگے ہوں گے۔

بھٹو پر الزام ہے کہ اُس نے —— دولت ضائع کی۔ اور اپنے ٹھاٹھ باٹھ پر قومی خزانے کی دولت لٹا دی۔

بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو الزام لگانے والے خود —— بھی تو جواب دیں کہ وہ اپنے حامیوں کو کس وجہ سے مدرسے کی قدیم عمارت اور زمین کو الاٹ کر دیتے ہیں۔

بھٹو جاگیردار تھا۔ اچھا کھانا اچھا پہننا اس کا شیوہ تھا۔ وہ ٹھاٹھ باٹھ زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ وہ پشتینی دولت مند تھا۔ روپے کی ہمیشہ سے اس کے گھر میں ریل پیل رہتی تھی۔

لیکن یہ لوگ جن کا ذریعہ معاش کچھ نہیں۔ اور خاندان بھی کسی اعتبار سے بھٹو کے خاندان کا ہم پلہ و رتبہ نہیں۔ یہ کیسے کاروں میں سفر کرتے اور ہوائی جہازوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اور کس ذریعے اور آمدنی سے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ذرا ایک بات کا جواب تو دیجئے کہ

دیوبند میں پڑھنے والا ایک شخص —— فارغ التحصیل ہو کر ایک مدرسے میں پڑھانے لگے۔ نہ اپنی زمین نہ جاگیر نہ جائیداد —— اور پھر وہ مختلف مدرسوں اور اسلامی مدارس میں پڑھاتا اور فتوے دیتا رہا۔ اور اس نے اپنے نو مہینے کے زمانۂ اقتدار میں بھی بڑی دیانت اور ایمانداری کا ثبوت دیا۔ اور اس کا دامن ہر برائی سے پاک ہے۔ اور اُس نے کبھی ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا ہے۔ اور اس کا ذریعہ آمدنی بھی بظاہر محدود ہے۔ تو پھر وہ کیسے —— اور کس طرح ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی کار خرید سکتا ہے؟ اور اس کا مالک بن سکتا ہے۔

اصل میں ایسے اور اس طرح کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کا ماضی نہ دیکھیے۔ اور نہ اُن کے حال پر ہی تنقید کیجیے۔ یہ چھلنیاں ہیں۔ یہ للی پوٹینز ہیں۔ اور —— گلیور —— پھانسی بھی چڑھ چکا ہے تو —— اس کا قد چھوٹا نہیں ہوا کرتا!!

غیر جانبداری کا بھرم

"یسوع حاکم کے سامنے کھڑا تھا۔ اور حاکم نے اس سے یہ پوچھا کہ"

کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے۔ یسوع نے اس سے کہا۔ "تو خود کہتا ہے" اور جب سردار کاہن اور بزرگ اس پہ الزام لگا رہے تھے۔ تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر پیلاطس نے اُس سے کہا کیا تُو نہیں سُنتا۔ یہ تیرے خلاف کتنی گواہیاں دیتے ہیں۔ اس نے ایک بات کا بھی اُس کو جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاکم نے بہت تعجب کیا۔

اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پہ لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برآبا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ ایک تمہاری خاطر چھوڑ دوں۔ برآبا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ انہوں نے اس کو حسد سے پکڑوایا ہے۔ اور جب وہ تخت عدالت پر بیٹھا تھا تو اس کی بیوی نے اسے کہلا بھیجا۔ کہ تُو اس راست باز سے کچھ کام نہ رکھ کیونکہ میں نے آج خواب میں اس کے سبب سے بہت دُکھ اٹھایا ہے۔ لیکن سردار کاہنوں اور بزرگوں نے لوگوں کو ابھارا کہ برآبا کو مانگ لیں اور یسوع کو ہلاک کرائیں۔ حاکم نے ان سے کہا ان دونوں میں سے کس کو چاہتے ہو۔ کہ تمہاری خاطر چھوڑ دوں۔ تو انہوں نے کہا برآبا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔ کیا کروں؟ سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے۔ اس نے کہا۔ "کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلّا چلّا کر کہنے لگے۔ کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوا ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے رُوبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا لیکن اس راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب میں کہا اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پہ۔ اس پہ اس نے برآبا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا۔ اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تا کہ صلیب دی جائے۔

(متّی کی انجیل۔ ب ۲۷۔ ۱۱ سے ۲۶)

کہتے ہیں کہ بھٹو کی لائبریری کی دیوار پہ حضرت عیسٰی کی ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں حضرت مسیح کو صلیب پہ لٹکے دکھایا گیا تھا۔

عہد نامہ عتیق کی مقدس کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ جو شخص دار پہ لٹکایا گیا۔ وہ لعنتیوں کی موت مرا۔ عیسائی مذہب کے عالموں نے اس جملے کی کئی تشریحات کی ہیں۔ اور عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح اور بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے مصلوب ہوئے تھے اور انہوں نے خداوند کے حضور بنی نوع انسان کی نجات کے لئے اپنا خون پیش کیا۔ مسیح نے اپنے آپ کو دار پہ لٹکا کر بنی نوع انسان کے گناہوں کا ازالہ کیا۔ ایک غیر عیسائی کے لئے اس عقیدہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ لیکن اپنی جگہ یہ بات بڑی اہم خوبصورت اور مثالی ہے۔ کہ کوئی انسان دوسروں کے لئے دکھ سہے۔ دوسروں کے لئے قربانی دے۔

انسان کی ایک یہ بھی صفت بیان کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے جیتا ہے۔ دوسروں کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ تمام مذاہب اور انسانیت کی نظروں میں وہ انسان برگزیدہ، برتر اور عظیم سمجھا جاتا ہے۔ جو دوسروں کے دُکھ دُور کرے۔ اور دوسروں کے لئے دکھ سہے۔ اسی اعتبار سے دیکھا اور سمجھا جائے تو عیسائی عقیدے کی بنیاد ایک اعلیٰ و ارفع ترین اصول پہ رکھی ہوئی ملتی ہے۔

بھٹو —— اور حضرت عیسٰی کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ بھٹو —— حضرت عیسٰی کی خاکِ پا بھی نہ تھے۔ لیکن —— بعض مشابہات ایسی ہیں۔ جو حیران کن ہیں۔ اور ایسی مشابہات حیران کن ہونے کے باوجود غیر معمولی نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان بعض اوقات ایسے حالات سے گزرتا ہے۔ جن حالات سے اُس سے پہلے کئی انسان گزر چکے ہیں۔ اور پھر اس مشابہت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہ —— مسیح مصلوب ہوئے۔ اور بھٹو بھی سولی پر چڑھے۔

مسیح جیسے پاکباز، خدا کے نبی اور رسول کو ایک عام مجرم کی حیثیت سے پھانسی دی گئی۔ اور اس عالم میں کہ مسیح کے دائیں بائیں —— جن اور لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ وہ چور اور اخلاقی مجرم تھے۔ اور انہوں نے صلیب کے وقت "مسیح" کا ٹھٹھا اڑایا تھا۔ . . . .

حضرت مسیحؑ کو بھی اس دور کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان پہ فردِ جرم عائد ہوئی اور ان کو سزا دی گئی۔

بھٹو کو بھی عدالت میں لایا گیا۔ اور ان پہ فردِ جرم عائد ہوئی۔ اور ان کو سزا دی گئی۔

یہ مماثلتیں —— موجود ہیں۔ لیکن ان مماثلتوں سے دونوں شخصیتوں کو یکساں سطح پہ لانا مقصود نہیں۔ کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ مسیحؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اور بھٹو —— صرف خدا کی ایک مخلوق . . . . !

جسے سُولی دی گئی وہ پیغمبر نکلا

حضرت مسیح دنیا میں خدا کا ایک نیا پیغام لے کر آئے تھے۔

بھٹو نے بھی پاکستان کی سیاست میں ایک نئی تبدیلی کی۔ ایک نیا نظام متعارف کرانے کی کوشش کی۔

حضرت مسیحؑ اور بھٹو کی زندگیوں کے المیوں اور رزمیوں کے دلچسپ کردار —— وہ ہیں۔ جنہوں نے ایک خاص طرح کا کردار انجام دیا۔

حضرت مسیحؑ کی زندگی کے المیہ اور رزمیہ میں یہ کردار —— کاہن ادا کرتے ہیں۔

اور بھٹو کی زندگی کے المیہ اور رزمیہ میں یہ کردار —— سیاستدانوں نے ادا کیا ہے!

ہر ملک میں حکومت وقت کے خلاف تنقید کی جاتی ہے۔ مخالف رہنما آواز اٹھاتے ہیں۔ اور تحریکیں بھی چلائی جاتی ہیں۔ کہ یہی جمہوریت کا مزاج ہے۔ اور اس مزاج میں احتجاج کا عنصر —— فطری اور قدرتی سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان قومی اتحاد نے بھی جناب بھٹو کے خلاف ایک تحریک چلائی۔ احتجاج کئے۔ لوگ سڑکوں پہ نکل آئے۔ بھٹو حکومت نے دوسری تمام حکومتوں کی طرح اس تحریک کی مزاحمت کی۔ اسے کچلنے کی کوشش کی۔ ہر طرح کے ذرائع اختیار کئے گئے۔ اور بھٹو دور کے آخری دنوں میں فوج بھی —— بھٹو حکومت کی اعانت کے

لیے باہر آئی۔ اور پھر پاکستانی افواج کے تینوں سربراہوں کا بیان بھی آیا کہ — وہ موجودہ حکومت کے ساتھ وفادار ہیں۔ اور ان کی وفاداریاں غیر متزلزل ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے احتجاجی جلوسوں نے بھی اسی طرح توڑ پھوڑ کی۔ سرکاری اور نجی املاک کو جلا دیا اور راکھ کیا۔ جس طرح اس سے پہلے کے احتجاجی جلوس کرتے رہے ہیں۔ فوج نے بعض شہروں میں احتجاجی جلوسوں پر آنسو گیس اور گولیوں کا استعمال کیا۔ کئی آدمی مر گئے۔

یہ جو کچھ ہوتا رہا ہے ہمارے ملک کی تاریخ اور روایت کے مطابق تھا۔ عوام ابھی طرح احتجاج کے لئے نکلتے رہے ہیں۔ اسی طرح پولیس اور سنگین حالات میں فوج کی گولیوں اور تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ بھٹو دور میں بھی یہی کچھ ہوا۔ اسی دور کی ”ظلم کی داستانیں“ ریڈیو سے نشر اور ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔ اور اخباروں میں تفصیل سے شائع ہوئیں۔ لیکن اس سے پہلے تیس برسوں اور پھر بھٹو کے عہد کے بعد — جو کچھ ہوا۔ جو ظلم اور زیادتی حکمران طبقے نے احتجاج کرنے والے عوام پر روا رکھی۔ اس کی تشہیر نہ ہو سکی اور نہ اس کی اجازت ہی دی گئی۔

بھٹو نے اپنے عہد حکومت میں بہت ظلم کئے۔ لیکن اتنے نہیں جتنے کہ مخالف پریس نے اور حکومت کے زیر انتظام ذرائع ابلاغ و اظہار کے اداروں نے بیان کئے۔ مبالغہ کتنا ہوا۔ اس کا اندازہ سب لوگوں کو ہے۔ حتیٰ کہ ان کو بھی جنہوں نے یہ داستانیں تصنیف کیں۔ لیکن اس سارے ظلم و ستم کے باوجود — بھٹو اور بھٹو سے پہلے کے حکمرانوں نے — انسانوں پر کوڑا نہ آزمایا تھا۔

آپ لوگ مسٹر بھٹو سے اتنے خائف کیوں ہیں؟

کوڑا لگنے کا سہرا — عبوری مارشل لاء حکومت ہی کے سر بندھتا ہے۔ اور اس اعتبار سے موجودہ مارشل لاء حکومت کو یہ اعزاز بھی ملتا ہے۔ کہ جو خیال اور جو کام اس سے پہلے کے مارشل لاء حاکموں کو نہ سوجھا تھا۔ وہ انہیں سوجھا۔ موجودہ حکومت نے کوڑے کی روایت کا آغاز کیا۔ اور اس روایت کی بانی ٹھہری۔

بات مذاکرات تک پہنچی۔ بھٹو حکومت اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کے مذاکرات شروع ہوئے۔ پاکستان قومی اتحاد کے رہنما — مرغیاں کھاتے، آئس کریم سے لذتِ کام و دہن اٹھاتے، مذاکرات میں شریک ہوتے رہے۔ اسی راہ میں کئی روڑے اٹکے۔ کئی مشکلات پیدا ہوئیں۔ تعطل بھی آیا۔ لیکن بالآخر — دونوں فریقین کی طرف سے مذاکرات کی کامیابی کا اعلان ہوا۔ اور مذاکرات میں جو فارمولا اور لائحہ عمل طے پایا تھا۔ اس کی منظوری دے دی گئی۔ بس دستخط ہونے باقی تھے۔

کہ دوسری کہانی شروع ہو گئی!

بعض باخبر حلقے کہتے ہیں۔ کہ مذاکرات کی کامیابی کو عین آخری وقت پر تحریکِ استقلال کے رہنما جناب اصغر خان نے ناکامی میں بدل دیا۔

بعض باخبر حلقوں کا کہنا ہے۔ کہ قومی اتحاد والے سُن گُن پا چکے تھے۔ کہ فوج آ رہی ہے۔

بہرحال یہ قیاس آرائیاں کچھ بھی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی روایت کے عین مطابق مارشل لاء پھر لگا۔ فوج پھر آئی۔ اور سول حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔

”آپریشن فیئر پلے،، کامیاب رہا!

اور اس کے بعد — نوے دن کا عرصہ جس کیلئے فوج نے ملک کا انتظام سنبھالا تھا۔ پھیلتا چلا گیا۔ طویل ہوتا گیا۔ اور کوڑے پڑنے لگے۔

بھٹو کے خلاف — زبانیں کھلتی گئیں۔ ”ڈائجسٹ،، پریس نے گندگی اور غلاظت کے ڈھیر لگا دیئے۔ لیکن، غیر جانبدار نوے دن کے لئے آنے والی — عارضی حکومت خاموش رہی۔ بلکہ اس حکومت نے بھٹو کے حامیوں، پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ”باز پرس“ شروع کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی کی۔ جو بھٹو کے خلاف لکھنے میں پہلے ہی بڑی شہرت کے حامل تھے۔ اُردو ڈائجسٹ کے جناب الطاف حسن قریشی کے اس انٹرویو کا ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ انٹرویو اس زمانے میں لیا گیا تھا۔ جب — ابھی ”آپریشن فیئر پلے،، کے بعد ۹۰ دن کی مدت پوری نہ ہوئی تھی۔ یعنی جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر — نہ صدر پاکستان تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے انتخابات ملتوی کئے تھے۔ اس انٹرویو کا یہ پیرا قابل غور ہے۔

> ”مجھے کسی سے ذاتی دشمنی نہیں،، جناب جنرل ضیاء الحق نے شیریں لہجے میں کہا“ ہم کسی کو غیر فطری طور پر ختم کرنا ہرگز نہیں چاہتے۔ قانون کا عمل ایک فطری عمل ہے۔ اور اگر حالات کی رفتار، قانون کی رفتار سے تیز ہوتی تو اس کے لئے ہمارے پاس مارشل لاء کے قواعد و ضوابط موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر بھٹو کا ماضی انہیں ختم کر دے گا۔ عوام کے سامنے حقائق آ جائیں۔ اور ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیئے جائیں تو خیر اور شر میں فرق کرنا بہت آسان ہو گا۔ میرے گوشۂ خیال میں یہ بات نہیں سماتی۔ کہ آپ لوگ مسٹر بھٹو سے اس قدر خائف کیوں ہیں۔ آخر وہ ایک آدمی ہی تو ہے۔ جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں،،
>
> (”صحافت،، صفحہ ۲۶ — ۱۸/اپریل ۱۹۷۹ء)

یہ بات ذہن میں رکھئے۔ کہ یہ انٹرویو اس دور میں لیا گیا۔ جب جنرل ضیاء الحق — بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر نئے نئے اقتدار میں آئے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے۔ ان دنوں وہ اپنے اس وعدے پر قائم تھے۔ کہ فوج نوے دنوں کے بعد بیرکوں میں چلی جائے گی۔ جناب بھٹو کو ان دنوں گرفتار کیا جا چکا تھا۔ ابھی ان کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ عدالت نے کوئی فیصلہ نہ دیا تھا۔ اور — جنرل ضیاء الحق قانون کی برتری کی بات بھی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی غیر جانبداری کا بھی اعلان فرماتے ہیں۔ لیکن — یہ بھی کہتے ہیں کہ

> ”اگر حالات کی رفتار قانون کی رفتار سے تیز ہوتی تو اس کے لئے بھی ہمارے پاس مارشل لاء کے قواعد و ضوابط موجود ہیں۔،،

یعنی اگر جناب بھٹو — قانون کی گرفت سے بچ بھی نکلتے ہیں تو مارشل لاء کا قانون تو موجود ہے۔ اسی امر کا اعلان بعد میں بھی کئی بار ہوا۔ کہ حکومت وقت آنے پر جناب بھٹو پر مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت بھی مقدمے چلائے گی۔ مقصد یہ تھا کہ بھٹو کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے۔

ایک طرف جنرل ضیاء الحق — یہ کہتے ہیں کہ — اُن کے خیال میں ”مسٹر بھٹو کا ماضی انہیں ختم کر دے گا،، اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ”حقائق،، ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیئے جائیں تو خیر اور شر میں فرق کرنا آسان ہو گا۔

بھٹو خیر کی علامت تھے یا شر کی۔ ابھی اس کا فیصلہ کسی عدالت نے نہیں کیا۔ اور یہ ایسا فیصلہ ہوتا ہے۔ کہ جسے دنیا کی کوئی عدالت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آخری سزا کا حقیقی فیصلہ صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کرتا ہے۔ اور دنیاوی فیصلے — خدائے لم یزل کے فیصلوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

لیکن — اپنے اقتدار — کے ابتدائی مرحلے میں ہی جنرل ضیاء الحق — اپنی تمام تر غیر جانبداریوں، عارضی ذمہ داریوں کے اعلانات کے باوجود — بھٹو کو شر قرار دے چکے تھے۔ اور ان کی یہ خواہش تھی۔ کہ بھٹو کی منفی تشہیر ملک کے گوشے گوشے میں ہوتی

ہم بھٹو کو سیاسی میدان میں شکست دیں گے

چاہیئے۔ جنرل ضیاء الحق اسی پہ اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے مخاطب کے حوالے سے ... سب کو للکارتے بھی ہیں۔ کہ

"میرے گوشۂ خیال میں یہ بات نہیں سماتی کہ آپ لوگ مسٹر بھٹو سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟"

یوں وہ دوسروں کو ابھارتے ہیں۔ اکساتے ہیں۔ وہ بھٹو کی تمام تر صلاحیتوں، اس کے تمام تر تاریخی اور منصبی پس منظر کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"آخر وہ ایک آدمی ہی تو ہے۔"

اور پھر دو ٹوک فیصلہ بھی عدالت کے ہر فیصلے سے پہلے دے دیتے ہیں۔

"بھٹو کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔"

اور پھر یہ دعویٰ بھی — "کہ مارشل لاء کی حکومت — بھٹو کے مقدمے میں فریق کی حیثیت نہیں رکھتی۔" ذہن میں رکھیئے۔ اور پھر جناب جنرل ضیاء الحق کے اس فیصلے کی دو ٹوک "معنویت" پہ غور کیجیئے......

پیلاطس نے حضرت مسیحؑ کے خون کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے حضرت مسیحؑ کے خون سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ یہ گویا ایک طرح سے "جانبداری" سے انحراف کرنے کی رسم تھی۔ لیکن اس میں منافقت کا عنصر تو بہر حال نظر آتا ہے — رومی حاکم پیلاطس اتنا کمزور اور اتنا بے بس بھی نہ تھا۔ کہ وہ اپنی حقیقی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس پہ عمل نہ کرا سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ — کاہنوں کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی۔ کہ وہ کاہنوں کے "واویلا" پہ کان نہ دھرتا۔ اور مسیحؑ کے بجائے براباکو مصلوب کرنے کا حکم دیتا۔

براباس میں تو پھر انسانیت کی رمق باقی تھی۔ کہ وہ شعلہ بنی۔ اور فرانس کے ناول نگار نے اس پہ عظیم ناول لکھا۔

ہمارے ہاں — بھٹو کیس میں جو براباز نظر آتے ہیں۔ ان کی انسانیت شاید دم توڑ چکی ہے۔

آرتھر کویسلر نے "یوگی اور کمیسار" کا موازنہ کیا تھا۔ مسیحؑ کے مقدمے اور بھٹو کے مقدمے کا مطالعہ کیا جائے تو کاہنوں کی قدر مشترک نظر آتی ہے۔ یہاں بھی "علمائے دین" اور "فقیہان کرام" موجود تھے۔ اور اپنے اپنے ذہنی تعصبات کے باوجود اپنی غیر جانبداری کا بھرم قائم رکھنے میں مصروف نظر آتے تھے اور اب بھی اُن کی — منافقت آمیز غیر جانبداری — کی مصروفیت کم نہیں ہوئی۔

جناب مولانا مفتی محمود نے فرمایا تھا۔ "ہم بھٹو کو سیاسی میدان میں شکست دینا چاہتے ہیں۔"

ایسے ہی خیالات کا اظہار اس ملک میں جمہوریت کی جنگ کے "عظیم چیمپئن" نوابزادہ نصراللہ خاں نے کیا تھا۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کچھ اور کہتے ہیں — وہ جناب الطاف حسن قریشی سے فرماتے ہیں۔

"آپ لوگ مسٹر بھٹو سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟"

اور پھر جناب جنرل صاحب! نے اپنے بعض بیانوں میں یہ بھی انکشاف فرمایا۔ کہ پاکستان قومی اتحاد کے کئی سربرآوردہ رہنماؤں نے ان سے منت سماجت کی۔ کہ انتخابات ملتوی کر دیئے جائیں۔"

اور یوں نوے دن کے بعد جن الیکشنوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ تاریخ مقرر ہونے کے باوجود نہ ہو سکے۔ کیونکہ جہاں مفتیانِ کرام اور قومی اتحاد کے رہنما — الیکشن ملتوی کرانے کے لئے گڑگڑا رہے تھے۔ وہاں خود جناب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا بھی ایک مؤقف تھا۔ کہ

"الیکشن کے نتائج مثبت ہونے چاہئیں۔"

"مثبت نتائج" کی توضیح اور تعریف جو ان کے ذہن میں متعین ہو چکی تھی۔ اس کی اور سرسری وضاحت لوگوں کو بیانوں میں دکھائی دی۔ لیکن کبھی — اس کی صحیح تعریف عوام کے سامنے نہ کی گئی۔

یہ غیر جانبدار سیاستدان — کاہن — اور غیر جانبدار حاکم — ایک طرف تو ایک شخص ایک جماعت کے خلاف کھلے رکیک اور انتہائی شرمناک پروپیگنڈے کی کھلی اجازت دے رہے تھے اور دوسری طرف پریس کو ضابطۂ اخلاق تیار کرنے اور صاف ستھری صحافت کی ضرورت میں زور دے رہے تھے۔

مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کے نعرے اور نصب العین کو اپنی سیاسی زندگی کا مقصد بیان کرنے والے مارشل لاء کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ مارشل لاء کو علاج درماں بتا رہے تھے۔ ایک بڑی دینی — جماعت نے تو خیر اپنی یہ روایت ہی بنا رکھی ہے۔ کہ ہر مارشل لاء کا ساتھ دیا جائے اور ہر مارشل لاء کو خوش آمدید کیا جائے۔

اور جمہوریت کی جنگ بھی لڑی جائے۔

فاشزم، فسطائیت کا الزام دوسروں پہ لگانے والے، غیر جانبداری کا دعوےٰ کرنے والے، اور جمہوریت کے چیمپئن — مارشل لاء کے مداح خواں کس طرح بن جاتے ہیں۔ اس کا — کوئی جواب ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

انہوں نے

منت کی کہ

انتخابات ملتوی

کر دیں

تضادات اور غیر جانبداری کی منافقت — کو سیاست بنانے والوں کو — ڈر تھا۔ خوف تھا۔ کہ — وہ بھٹو کے ہوتے ہوئے پیپلز پارٹی کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ۱۹۷۷ء کے الیکشنوں میں لاکھ دھاندلیاں ہوئی ہوں۔ پھر بھی جیتی پیپلز پارٹی ہی تھی۔

اور وہ اسی لئے الیکشن کا التوا چاہتے تھے۔ کہ اب بھی ان کی اپنی نو جماعتوں کے اتحا کے باوجود ان کی جیت کے امکانات نہ تھے۔

پھر بھی وہ دعوےٰ کرتے تھے کہ بھٹو کو وہ سیاسی میدان میں شکست دیں گے۔ بلکہ د یہاں تک کہتے تھے۔ کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ بھٹو کو سیاسی موت مارا جائے۔ لیکن ا

مفتی محمود نے کہا: "میرا بھٹو کی پھانسی سے کوئی تعلق نہیں"

کے دلوں میں چور تھا۔ کہ وہ بھٹو کو سیاسی موت نہیں مار سکتے۔ بھٹو کا اور کسی طرح سے خاتمہ ہو تو وہ جیت سکتے ہیں۔

۱۹۷۲ء کے بعد سے ہر معاملہ میں احتساب کا عمل شروع ہوا۔ اب اگر اس ملک کا عام آدمی یہ سوال کر لے کہ ۱۹۷۲ء کے بعد تو جناب جنرل ضیاء الحق کو بھی کئی سینئر فوجی افسروں کو نظر انداز کر کے چیف آف سٹاف بنا کر بھٹو نے اپنے مفادات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی۔

تو اس سوال اور اس الزام کا جواب کیا ہو گا؟

جمہوریت کی بحالی اور جمہوریت کے علمبرداروں نے بھٹو کی پارٹی کے کارکنوں سے جیلیں بھر جاتے پر ایک لفظ بھی جمہوریت کے حوالے سے کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

کیونکہ وہ تو غیر جانبدار تھے۔

وہ تو کہتے تھے۔ کہ ہم فوجی حکومت میں شریک نہ ہوں گے۔

پھر انہوں نے کتنے ہی پرجوش اعلانوں کے بعد — اپنے ہی لفظ چاٹے اور نگلے اور فوجی حکومت کے ساتھ تعاون پر مجبور ہو گئے۔ اور اس کے بعد بھی — جہاں وہ اپنی خود مختار وزارتوں پر اترا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم تو بندھے ہوئے ہیں۔ مجبور ہیں۔ اور اصل حکومت تو مارشل لاء کی ہے۔ اصل فیصلے تو فوجی کرتے ہیں۔

"ہم غیر جانبدار معاون ہیں!"

وہ لوگ جو اصول کے نام پر رائے دعویٰ کرتے تھے۔ جب فوجی حکومت کے زمانے میں — بے دریغ ریڈیو اور ٹی وی اور ٹرسٹ کے اخباروں کو بھٹو کی کردار کشی کے مورچے بنایا گیا تو ان کے اصولوں کو مطلق ٹھیس نہ لگی۔ ان کے اصول قائم رہے۔ صرف زبانیں خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ وہ تو غیر جانب دار تھے!

ان کاہنوں، ان رہنماؤں نے واویلا کیا۔ "بھٹو کو کیفر کردار" تک پہنچانے کا! پیلاطس تو پھر ہاتھ دھونے پر مجبور ہوا تھا۔ لیکن اُوپر والے اس کے بھی روادار نہ تھے۔ اور تھے بھی تو — اسی حوالے سے کہ — قانون کے فیصلہ پہ عمل ہو گا۔ حالانکہ آخری فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ردّو بدل کرنے کے مجاز تھے۔ یہ ان کے بس میں تھا۔ مگر زندہ بھٹو — سب کے لئے خطرہ بن چکا تھا۔ وہ اعصاب پر مسلّط ہو گیا تھا۔ اس کی موت ملک کے بہترین مفاد میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ اور ان میں سے کوئی ایک نہ تھا۔ جو یہ کہتا کہ — بھٹو کی سزا میں تخفیف کر دی جائے۔

بھٹو کے پھانسی لگنے کے بعد جناب مفتی محمود نے جلدی سے ہاتھ دھونے کی کوشش کی اور اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ

"ان کا بھٹو کی پھانسی سے کوئی تعلق نہیں۔ قانون نے فیصلہ کیا ہے اور مارشل لاء انتظامیہ نے اس کی توثیق کر دی۔"

بے چارے مولانا مفتی محمود — ان کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کہ وہ بھٹو کو سیاسی میدان میں شکست دیں۔

اور پھر ان میں وہ کاہن بھی تو تھے۔ جو زور و شور سے واویلا کرتے تھے۔ جن کے سرخیل چوہدری ظہور الٰہی تھے۔ جنہوں نے بھٹو کو پھانسی چڑھانے کا مطالبہ کیا۔ پھر یہ "مژدہ" بھی دیا کہ بھٹو کو پھانسی ہو کر رہے گی۔ ان کے بیان — آج بھی اخباروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ "عوامی" مطالبہ بنا کر بھٹو کو پھانسی دلوانے کے لئے واویلا کر رہے تھے۔

اور پھر زاہد سرفراز جیسے بھی تو تھے۔ کہ جنہوں نے فرمایا "اگر بھٹو کو پھانسی نہ دی گئی تو وہ اس کے خلاف تحریک چلائیں گے۔"

اور اب جب کہ بھٹو کو پھانسی ہو چکی ہے تو یہ لوگ "عبرت حاصل کرنے کا درس" دے کر — ہاتھ دھو رہے ہیں!!

غیر جانبداری کا بھرم رکھنے کی روایت بھی صدیوں پرانی ہے۔

اور اس وقت مجھے حضرت مسیحؑ کے حوالے سے دو باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ایک تو NIKOS KAZAZAKS کا ناول ہے CHRISTRECRUCI FIED اور دوسرے اناطول فرانس کی وہ کہانی — جس میں پیلاطس بوڑھا ہو گیا ہے۔ اب وہ گورنر نہیں ہے۔ اور وہ اپنے دیہی مکان میں بڑھاپے کے دن گزار رہا ہے۔ اور اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ جس کے مصلوب کئے جانے کے فیصلے پر اس نے ہاتھ دھوئے تھے۔ وہ پیغمبر نکلا اور بے گناہ بھی!!

یہ عالمی ادب کے یہ دونوں شہکار KAZANTAZKS کا ناول اور اناطول فرانس کی کہانی — جانے مجھے کیوں بھٹو کے حوالے سے یاد آ رہے ہیں۔

شاید — بلکہ اغلباً اس لئے کہ غیر جانبداری کا پول بھی جلد یا بدیر کھل جایا کرتا ہے۔ اور کاہنوں کا واویلا بھی رنگ لایا کرتا ہے۔ لیکن یہ کاہن ہی بعد میں قابل نفرت قرار دیئے جاتے ہیں، اور — سب سے بڑھ کر یہ کہ — انسانی تقدیر کا فیصلہ متعصب کاہن اور منافق غیر جانبدار کریں تو اس میں تھوڑی بہت کھوٹ ضرور رہ جاتی ہے!

کاش میں — اس مضمون کی فضا اور مجموعی تاثر کو برقرار رکھنے کے لئے یہ "لطیفہ" آپ کو نہ سنا سکتا کہ جب — کسی نے کسی سے غیر جانبدار کی تعریف پوچھی تو اُس نے جواب دیا۔

"غیر جانبدار وہ ہوتا ہے۔ جس کا نہ ماں ہو نہ باپ۔"

جنگ اور امن سچ اور جھوٹ — خیر اور شر — انصاف اور بے انصافی — نیکی اور ظلم کے ہوتے ہوئے — کوئی کیسے غیر جانبداری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

ہاں — منافق یہ کام بھی کر دکھاتے ہیں!!

بھٹو —— کہ ایک آدمی تھا

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاالحق نے بھٹو کے بارے میں کہا تھا۔

"آخر وہ ایک آدمی ہی تو ہے، جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں"۔

جناب جنرل ضیاالحق نے بالکل بجا اور درست فرمایا تھا۔ واقعی بھٹو ایک آدمی تھا۔ خاک کا پتلا۔ آدم کی اولاد..... ایک آدمی...... وہی آدمی۔ جسے خدا نے اپنی شبیہ پر بنایا تھا جسے دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ وہی آدمی، جس کی تکریم کے لیے معلم الملکوت کو حکم خداوندی ہوا کہ وہ اس آدم۔ اس خاک کے پتلے کو سجدہ کرے۔ کائنات کا حسن، مرکز اور محور آدمی۔ وہی آدمی، جو خوبیوں اور خامیوں کا پتلا ہوتا ہے۔ وہی آدمی جس کے لیے خدا نے کائنات تخلیق کی اور آدمی کو یہ آزادی بخشی کہ وہ قتل کرے یا قتل ہو جائے۔ وہ رحم کرے یا سفاک بن جائے اور دنیا اور اس دنیا کی ہر شے پر انسان کو قادر کر دیا۔ اُسے علم دیا، اشیا کی حقیقت کا شعور بخشا۔

اور آدمی آسمانوں تک پہنچا۔ آدمی زمین کی پاتال تک کو چھو آیا اور آدمی نے فطرت کو تسخیر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ہر روز اس کا قدم حدِ امکاں سے آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آدمی، جس کا دل مختلف جذبوں اور احساسات کی جولانگاہ ہوتا ہے۔ آدمی جو مقدر کو بگاڑتا بھی ہے اور سنوارتا بھی ہے۔ آدمی، جس پر کل کائنات نثار کر دی گئی۔ آدمی جو پیغمبروں کا مخاطب رہا اور جس کے لیے دنیا میں پیغمبر بھیجے گئے اور رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹے۔ دنیا کی ہر چیز آدمی کے قدموں میں ڈال دی گئی اور آدمی کو تضادات کا حسن بخشا گیا اور بھٹو —— وہ بھی ایک آدمی تھا۔ لیکن جناب جنرل صاحب کے جملے کے تیور دیکھئے۔

آخر وہ ایک آدمی ہی تو ہے......

جیسے آدمی کوئی بڑی حقیر، بڑی معمولی، بڑی چھوٹی چیز ہوتا ہو۔ بے وقعت، بے قدر و قیمت، ایک چیونٹی سے بھی کمزور اور معمولی چیز اور پھر جس لہجے میں یہاں آدمی کی تحقیر ہوئی۔ اس کو بعد کے جملے نے اور ہی طرح تکمیل بخشی ہے۔

"جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔

یعنی تحقیر و ذلت کی انتہا..... اس سے بدتر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک تو آدمی حقیر و ذلیل ہو اور پھر آدمی بھی ایسا کہ جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہوں....

بخدا کسی مردم بیزار، انسان ناشناس، اور بنی نوع آدم سے مایوس فلسفی اور قنوطی نے بھی آدمی کی اس طرح تحقیر و تذلیل نہ کی ہوگی، جیسی اس جملے میں کی گئی ہے۔ آدمی کو اتنا بے حیثیت اور بے مایہ کسی نے نہ کیا ہوگا......

اپنی اپنی نگاہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کا فرق ہے ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بھٹو بھی ایک آدمی تھے ایک آدمی کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والدین آدمی تھے۔ ان کے بہن بھائی آدمی تھے۔ انہوں نے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کی اور آدمیوں کی طرح تعلیم حاصل کی۔ آدمیوں کی طرح انہوں نے محبت بھی کی ہوگی اور نفرت بھی۔ آدمی ہی کی طرح اُن سے غلطیاں بھی ہوئیں اور اچھے کام بھی اور آدمیوں کی طرح ہی وہ آدمیوں میں سے آئے اور آدمیوں پر چھا گئے۔ اور لوگوں نے انہیں ایک آدمی کو "قائد عوام" بنا دیا اور وہ اس ملک کے صدر، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور وزیراعظم بنے۔ ان کی آئینی حکومت کا تختہ الٹا گیا اور وہ آدمیوں کی طرح ہی قید کر لیے گئے۔ کیونکہ اگر وہ آدمی نہ ہوتے تو قید نہ ہوتے اور نہ ہی ان پر مقدمہ چلتا، نہ ہی ان کو پھانسی کی سزا دی جاتی اور چونکہ وہ آدمی ہی تھے کہ جب انہیں پھانسی پر لٹکایا گیا تو وہ زندہ نہ رہے۔ کیونکہ آدمی زندہ نہیں بچتا۔ اُسے ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے —!

یہ بات صرف ایک آدمی ہی جانتا ہے کہ، جہاں وہ اس دنیا میں پیدا ہوا ہے وہاں اُسے ایک دن اس دنیا سے اُٹھ جانا ہے۔ موت کا ذائقہ چکھنا ہر شخص کا مقدر اور انجام ہے اور آدمی ایک دن مر جاتا ہے۔ ہاں آدمی کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیسے مرے گا۔ اُس کی موت کس طرح سے آئے گی۔

لیکن وہ لوگ، جو صرف آدمی نہیں ہوتے..... بلکہ آدمی سے کچھ بڑھ کر ہوتے ہیں وہ شاید دوسرے آدمی کی تقدیر کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں کیونکہ یہ بھی آدمی کی ہی دنیا میں ہوتا ہے کہ بعض اوقات آدمی، غیر معمولی آدمی۔ آدمی کی تقدیر کا مالک بن جایا کرتا ہے اور اس کے ہاتھ میں کسی انسان کی زندگی کی باگ ڈور آ جاتی ہے اور وہ مجاز ہوتا ہے (عارضی طور پر ہی سہی) کہ وہ کسی کی جان نہ لے۔ یا پھر اس کی جان لے لے ..... لیکن، بھٹو ایسا آدمی نہ تھا..... کہ اُسے کوئی عارضی طور پر جان لینے کا حق حاصل ہو گیا ہو۔ وہ قاتل ضرور تھا لیکن ناکام قاتل...... وہ منصوبہ ساز اور سازشی بھی تھا بلکہ بڑا سازشی ..... بڑا ملزم۔ لیکن آدمی تھا، معمولی آدمی، حقیر آدمی۔ اسی لیے تو وہ جس شخص کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جس شخص کو قتل کرنے کی اُس نے سازش کی اُس شخص کو قتل نہ کر سکا۔ وہ شخص تو زندہ ہے اور جس شخص کو بھٹو نے کبھی قتل کرنے یا ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ وہ بھٹو کی سازش کا شکار ہو گیا۔ احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش ہوئی۔ لیکن مارے نواب محمد احمد خان گئے۔

بتائیے ایسا آدمی، بڑا آدمی، یا آدمی سے بڑھ کر کچھ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے تمام تر اختیارات و وسائل کے باوجود جس کو قتل کرانا چاہے۔ اُسے قتل بھی نہ کرا سکے۔ واقعی بھٹو معمولی آدمی تھا۔ بڑے آدمی اور آدمی سے کچھ اور بڑے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جس چیز کا تہیہ کر لیں۔ اس کو انجام تک پہنچا دیں اور ان کا کوئی منصوبہ ناکام ہو بلکہ یہ منصوبہ بڑی ہمواری بڑی صحت اور صحیح سمت میں مکمل ہو جائے۔ ان کا آپریشن مکمل ہو اور ان کے منصوبے اور ان کے کیس کو واقعی فیئر پلے کہا جا سکے۔

بھٹو جیسے آدمی، معمولی آدمی (آخر وہ ایک آدمی ہی تو ہے) ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ جبکہ آدمی سے آگے کی مخلوق...... آگے کی چیزیں، کامیاب و کامران رہتی ہیں۔

معمولی آدمی کا نام تاریخ میں نہیں آتا اور اگر تاریخ میں کسی صورت یہ نام کہیں بھی آئے تو اسی نام کو مٹا دیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے آدمی جو 'آخر ایک آدمی' کی ذیل میں آتے ہوں اور اُن کے ہاتھ خون میں رنگے ہوں۔ اُن کا نام لینا مملکت میں ممنوع قرار دیدیا جائے۔

ایسے آدمیوں کا نام یاد نہیں رکھنا چاہئے۔ انہیں بھلا دینا چاہیے۔ ان کے نام کو مٹانے کے لیے خصوصی اختیارات اور احکام سے ہی کیوں نہ کام لینا پڑے۔ یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔

ریڈیو والوں کو حکم دیدیجیے کہ ایسے آدمی کا نام کبھی ریڈیو پر نہ آئے۔

ٹی وی والوں کے لیے بھی یہ حکم ایضاً ایضاً ہے.....

حکومت کے اخباروں اور حامی اخباروں کو بھی حکم و ہدایت جاری کئے جائیں کہ ایسے آدمی کا نام شائع ہو، نہ تصویر۔

اور اس نام کو قابلِ نفرت بنا دیجئے۔ مٹا دیجئے۔ زبانوں پر لانے کی ممانعت کر دیجئے.....

(۲۸ اپریل ۱۹۷۹ء کو رات پاکستان ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام "صدر اور وزیراعظم کے آئینی اختیارات" کے بارے میں ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ یہ راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی ویژن

کی پیشکش کی تھی۔ اس میں میزبانی کے فرائض جناب سردار محمد اقبال موکل نے انجام دیئے۔ شرکا میں مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) وحیدالدین، جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن اور جناب ایس۔ ایم ظفر شامل تھے۔ ان حضرات نے پاکستان کے قیام کے بعد جتنے دستور بنے۔ ان کا حوالہ دیا، غلام محمد مرحوم، خواجہ ناظم الدین مرحوم، ایوب خان مرحوم، یحییٰ خان۔ سب کا نام ان کی زبانوں پر آیا۔ لیکن ۱۹۷۳ کا متفقہ طور پر بننے والا آئین۔ جس پر یہ بحث ہو رہی تھی، اس کا بار بار ذکر ہوا۔ اس آئین کے خالق صدر اور وزیرِ اعظم بھٹو کا ذکر بار بار آیا لیکن صیغہ غائب میں اور سوائے جناب ایس ایم ظفر کے بڑے منفی انداز میں، لیکن بھٹو کا نام ایک بار بھی کسی کے ہونٹوں پر نہ آیا۔ جناب ایس ایم ظفر نے بڑی وزنی اور اہم گفتگو کی۔ لیکن بھٹو کا نام لینے سے وہ بھی کتراتے رہے۔ شاید ایسی کوئی ہدایت تھی کہ 'صرف آدمی' — بھٹو کا نام زبان پر نہ لایا جائے۔

لیکن۔ لیکن یہ نفسیاتی مسئلہ تو نہیں ہے...... ذاتی نفسیاتی مسئلہ جسے اجتماعیت کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ بعض اوقات جسے احساسِ برتری سمجھا جاتا ہے وہ دراصل احساسِ کمتری ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جس شخص یا چیز کو ہم حقیر اور معمولی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ دراصل وہ چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی اور جسے ہم معمولی سمجھتے ہیں اصل میں اُس کی برتری کے خوف اور بوجھ کے نیچے دبے ہوتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک ایسے ہی نفسیاتی مسئلے کی سی بات ہے۔

ورنہ دیکھئے کہ جسے ہم صرف ایک آدمی کہتے ہیں اُس کے ساتھ "صرف ایک آدمی کا سا سلوک نہیں کیا جاتا۔ اسی آدمی کے مقدر میں رات اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ اس آدمی پر رات مسلط کر دی جاتی ہے اُس کے ساتھ دن کے اجالے میں شاید کسی کو آنکھیں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے رات کی تاریکی کا سہارا لیا جاتا ہے۔

رات کی تاریکی میں اُس کی حکومت کا تختہ الٹا جاتا ہے۔

رات کی تاریکی میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ اس کی ضمانت ہوتی ہے تو راتوں رات مقدمہ سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ میں منتقل ہو جاتا ہے۔

رات کی تاریکی میں اس کے بارے میں اہم احکام صادر ہوتے ہیں۔

رات کی تاریکی میں اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

معمولی اور صرف ایک آدمی کے لیے تو ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا وہ تو صرف ایک عام آدمی ہے جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی حفاظت کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کو اگر کورٹ لکھپت جیل میں رکھا جاتا ہے تو جیل کے ارد گرد خصوصی انتظام کیے گئے ہیں۔ اسے رات کی تاریکی میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کیا جاتا ہے۔ اُسے اگر کبھی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کو ایسے راستوں سے لایا جاتا ہے جو خصوصی طور پر اس کے لیے کھولے گئے ہیں۔ اُس کو باپردہ کار میں سوار کیا جاتا ہے تاکہ اُسے باہر سے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کی آمد و رفت کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مکمل رازداری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تاکہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکے۔

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کیا تھا 'صرف ایک آدمی' کے مقدمے پر سرکار اور حکومتیں اتنا روپیہ خرچ نہیں کیا کرتی ہیں۔ 'صرف ایک آدمی' کے "اعمالنامے" کو سامنے لانے کے لئے لاکھوں روپوں کے اصراف سے وائٹ پیپر شائع نہیں کئے جاتے۔

اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے تو پھر اس سے بڑا اس کا کیا جرم ہو سکتا تھا کہ اس کے 'ضمنی اعمال' کو بھی اتنے غریب ملک میں اتنے کثیر سرمائے کے اصراف بے جا سے اچھالا اور نشر کیا جاتا ہے۔ جب اُس کو قتل کے مقدمہ کے بڑے ملزم اور بڑے مجرم کی حیثیت سے پھانسی دے ہی دینا تھی تو پھر اس کے خلاف دوسری قسم کی بدعنوانیوں کی اتنی تشہیر کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ آپ زندہ آدمی سے تو بدلہ اور حساب چکا سکتے ہیں لیکن مردہ آدمی کو بار بار سزائیں نہیں دے سکتے اور مر جانے والے کے ساتھ اس کی تمام برائیاں بھی دفن ہو جاتی ہیں۔

کیونکہ خوبیوں اور اچھائیوں کو کبھی موت نہیں آتی!!

'صرف ایک آدمی' جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے" کو جب پھانسی کی سزا سنائی گئی تو ساری دنیا کے دارالحکومتوں میں اس کا شدید ترین ردِ عمل ہوا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی سربراہ مملکت، حکمران اور حکومت ایسے ہوں گے جس نے اس 'صرف ایک آدمی' جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے" کی جان بخشی کی اپیل نہ کی ہو۔

آخر اس "صرف ایک آدمی" جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے" میں کوئی ایسی خوبی تو ہو گی کہ سیاست دانوں، حکمرانوں، سربراہوں، دنیا کے ہزاروں انسانوں نے اس کی جان بخشی کے لئے اپیل کرنے کی زحمت کی۔

لیکن، نہیں بھٹو صرف ایک آدمی ہی تھا کہ جس کو اگر تھپیڑ مارا جاتا تو اس کا منہ لال ہو جاتا۔ جسے اگر اذیتیں دی جاتیں تو وہ تکلیف محسوس کرتا۔ جسے ستایا جاتا تو وہ دکھ محسوس کرتا۔ تکلیف اذیت اور دکھ میں وہ ایک آدمی کی طرح ہی ردِ عمل کا اظہار کرتا تھا اور وہ آدمی ہی تھا کہ جب اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا اور اس کو پھانسی دی تو وہ مر گیا۔

وہ صرف ایک آدمی اور ایک قاتل تھا! اسی لیے تو اُسے موت آ گئی جبکہ وہ لوگ جو صرف ایک آدمی نہیں ہوتے۔ انہیں ابدی زندگی دی گئی ہے اور وہ کبھی نہیں مریں گے۔!!

اس صرف ایک آدمی کو جب پھانسی دی گئی۔ رات کے اندھیرے میں تو ایسے انتظامات کیے گئے جو صرف ایک آدمی کے لیے نہیں کیے جاتے۔ اس سلسلے میں ہم انہی لوگوں کے حوالے اور انہی لوگوں کی آرا پیش کریں گے۔ جو حکومتِ وقت کے قریب ہیں۔ حکومتِ وقت کی پالیسیوں کی تائید کرتے ہیں اور بھٹو کو حقیر و مردود ٹھہرانے میں پیش پیش رہے تھے۔

> "مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے کی تاریخ اور وقت کے معاملے میں ایسی رازداری کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور جس کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے جن لوگوں کا انتخاب کیا گیا۔ ان کے بارے میں پوری احتیاط کر لی گئی تھی کہ وہ راز کو آخری لمحے تک اپنے سینے میں چھپائے رکھنے کے اہل ہیں۔ انتہا یہ کہ جلاد اور میت کو غسل دینے والے مولوی صاحب کو جیل کے اندر کمروں میں بند رکھا گیا۔ مسٹر بھٹو کو ایسے وقت میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔ جب بہت سے لوگ اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

(ہفت روزہ "بادبان" صفحہ ۵ شمارہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۹ء)

> "پھانسی گھر تک پورے راستے میں دو صد گیس جلا کر رکھ دیئے گئے تھے اگر بجلی چلی جائے تو کیا ہو گا" اس سوال کا عملی جواب پورے راستے کے ساتھ دو صد کے قریب مسلح محافظ کھڑے ہیں۔

(ہفت روزہ "زندگی" صفحہ ۷، شمارہ ۱۳ تا ۱۹ اپریل ۱۹۷۹ء)

> "پھانسی گھر کے چاروں طرف مجھے کافی لوگ نظر آئے۔ ان میں وردیوں والے بھی تھے اور بغیر وردیوں والے بھی۔ کم از کم ڈھائی سو کی نفری ہو گی۔
>
> "کیا یہ درست ہے کہ پھانسی دینے کے بعد موقع پر سے ہی جنرل ضیاالحق صاحب کو اطلاع دی گئی تھی؟
>
> "تارا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا، میں نے بتایا ہے کہ وہاں وائرلیس والی جیپیں اور افسر موجود تھے۔ انہوں نے اپنے بڑے بڑے افسروں کو ضرور بتایا ہو گا۔ میں تو بہرحال آدھا گھنٹہ لاش کے پاس کھڑا رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے کچھ نہیں سنا۔"

(تارا مسیح سے انٹرویو، ہفت روزہ 'صحافت' ۱۸ اپریل ۱۹۷۹ء)

کیا یہ سب انتظام "صرف ایک آدمی اور ایک قاتل" کے لیے کئے جاتے ہیں کہ — وہ جس جیل میں قید ہو۔ وہاں طیارہ شکن توپیں، راڈار اور جانے کن کن چیزوں کی تنصیب کی گئی تھی کیا یہ "صرف ایک آدمی، جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوں" کو ہی اعزاز ملتا ہے کہ ہائی کورٹ میں جب اُس پر مقدمہ چلایا جائے تو اس کے لیے ایک خصوصی کٹہرا راتوں رات بنوایا جائے۔

یقیناً اصل بات کچھ اور ہے...... لیکن۔ ہم کہ جو خود آدمی ہیں یہ مان لیتے ہیں کہ بھٹو صرف ایک آدمی تھے اور ان کے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔

ویسے یہ بہت کم لوگوں کو علم ہوتا ہے (یا بہت زیادہ لوگوں کو علم ہوتا ہے) کہ ایک آدمی ہونا کتنی بڑی بات ہوتی ہے 'صرف ایک آدمی ہونا۔ نہ شیطان، نہ منافق نہ فرشتہ نہ بلکہ صرف ایک آدمی۔ صرف ایک آدمی!!

"سُرخ فیتہ"

جیسے دیکھو۔ نالاں۔ گریہ کرتا ہوا، شکایت لبوں پہ۔

ہر کام اٹک جاتا ہے۔ "پہیئے" لگاؤ تو کچھ دھکا لگتا ہے۔ پھر بھی کام جتنی تیزی اور رفتار سے ہونا چاہیئے۔ وہ نہیں ہو پاتا۔ تیس اکتیس برسوں سے ایک ترکیب ہماری روزمرہ زندگی میں بڑی مقبول ہوئی — "سُرخ فیتہ"

سرخ فیتے والی فائل میں جانے کتنے اہم اور ضروری مسائل دبے رہ جاتے ہیں۔ کبھی حل نہیں ہو پاتے۔ اور بعض اوقات تو جس کا مسئلہ ہو وہ مر کھپ جاتا ہے۔ لیکن مسئلہ ہنوز حل طلب ہوتا ہے۔

جن کا کوئی مسئلہ۔ کسی سرکاری دفتر میں پھنس گیا، وہ چکرا اٹھتا ہے۔ سفارشیں تلاش کی جاتی ہیں۔ رشوت دی جاتی ہے۔ جوتیاں چٹخائی جاتی ہیں اور پھر بھی کام مکمل ہو جائے تو نفل پڑھے جاتے ہیں۔

اہم "ضروری" اور روزمرہ کے کاموں کو تاخیر سے نمٹانے کی روایت خاصی قدیم ہے۔ عدالتی نظام کے بارے میں قانون دان اور خود منصف حضرات کئی بار تقاضا اور مطالبہ کر چکے ہیں کہ اسے تبدیل کیا جانا چاہیئے۔ پاکستان میں انصاف کا حصول بعض اوقات اتنا مہنگا اور اکثر اوقات اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ خود انصاف کے طلب گار جھنجھلانے لگتے ہیں کہ یہ اپنی جان کو کس مصیبت میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگ اسی لیے کچہری عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے گریزاں ہیں کہ جو کام دنوں میں ہو جانا چاہیئے، وہ مہینوں، برسوں میں بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ فرسودہ سرکاری دفتری نظام، ٹھٹھرے ہوئے ماحول میں انسان گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ شکایت کرنے والا، مسئلے کا حل تلاش کرنے والا تنگ آ جاتا ہے۔

سرخ فیتے کی لعنت پر ہمارے ملک میں بہت کچھ لکھا گیا۔ بڑی بڑی دلدوز اور المناک کہانیاں اور خبریں اخباروں میں پڑھنے کو ملی ہیں اور اس انسانی مسئلے کو ہمارے ادب کے علاوہ عالمی ادب میں بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے

گوگول کے عالمی فن پارے "اوورکوٹ" کے اکاکیوچ کا جو حشر دفتری کارروائیوں نے کیا وہ عالمی ادب کا ایک استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔ بے چارے اکاکیوچ نے اپنے پرانے بوسیدہ اوورکوٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے سخت سردی سے بچنے کے لیے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر، اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کا گلا گھونٹ کر، قرض لے کر، ایک نیا اوورکوٹ سلوانے کی ہمت کر ہی ڈالی تھی۔ اور یہ غریب اکاکیوچ اور اس کے دفتری رفیقوں کی زندگی میں اتنا اہم واقعہ تھا۔ کہ انہوں نے نئے اوورکوٹ کی خوشی میں۔ اکاکیوچ کو دعوت بھی دے ڈالی۔

وہ ساری تفصیلات جنہیں گوگول نے لکھا ہے۔ وہ رُلا دیتی ہیں۔ کہ کس طرح بے چارے اکاکیوچ نے جو ایک دفتر میں معمولی نقل نویس تھا۔ جز رسی، قناعت اور کنجوسی سے کام لے کر وہ اوورکوٹ سلوایا تھا اور وہ اوورکوٹ پہن کر جب وہ پہلی بار رات کو اپنے دوستوں کی طرف سے دی گئی دعوت میں شریک ہونے کے لیے گیا تو اسے ساری دنیا بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ نئے اوورکوٹ کو پہن کر وہ بدل گیا تھا۔ لیکن اسی شب واپسی میں۔ راہزنوں نے اس کا نیا اوورکوٹ چھین لیا۔

اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ اپنا اوورکوٹ واپس لینا۔ الجھے ہوئے اور انسان کو ذلیل کر دینے والے دفتری اور سرکاری نظام نے اکاکیوچ کی زندگی کو خوار کر دیا۔ مختلف محکموں، دفتروں میں وہ حسب ہدایت گھوم رہا ہے۔ اپنا حق مانگتا ہے۔ لیکن کوئی اس کی شنوائی نہیں کرتا۔ پیچیدہ دفتری نظام کے شکنجے میں وہ کسا جاتا ہے۔ اس کی رُوح بھی گھائل کر دی جاتی ہے۔ اور یوں ایک دن۔ اکاکیوچ بے چارہ دفتری نظام۔ سرخ فیتے کی لپیٹ میں آ کر مر جاتا ہے۔ اس کی رُوح بھوت بن کر سرکاری افسروں کا تعاقب کرتی ہے۔ جنہوں نے اسے اس بوسیدہ گھن دیتے دفتری نظام کی مشین میں کچل کر رکھ دیا تھا۔

اردو میں لکھی ہوئی دو چیزیں بھی مجھے بے اختیار یاد آ رہی ہیں۔
ایک تو قدرت اللہ شہاب کا تمثیلچہ "سرخ فیتہ" ہے۔
اور دوسرے کرشن چندر کی ایک کہانی ہے . . . .

"سرخ فیتہ" کے نام سے تو ظاہر ہے کہ اس تمثیلچے میں دفتری نظام اور اس کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر کیسا طنز ہو گا۔ لیکن کرشن چندر کی کہانی میں کینوس ذرا وسیع ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ سنگین بھی۔ کیونکہ۔ یہاں انسانی جان کا مسئلہ ہوتا ہے۔ کرشن چندر کی اس کہانی کا ہلکا سا تعارف اور خاکہ ہی یہاں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے طنز اور اس موضوع کے ساتھ اجو انصاف کیا گیا ہے اس کا صحیح لطف تو پوری اور اصل کہانی پڑھ کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔

کہانی کچھ اس طرح ہے . . . . !

ایک رات بڑے زور کی آندھی آئی۔ خوب جھکڑ چلا اور سیکرٹریٹ کے لان میں جامن کا۔ ایک درخت گر پڑا۔ صبح مالی نے دیکھا تو اس درخت کے نیچے ایک آدمی بھی دبا پڑا تھا۔ جو ابھی زندہ تھا۔ مالی نے اس واقعہ کی خبر چپراسی کو، چپراسی نے کلرک کو۔ کلرک نے آفس سپرنٹنڈنٹ کو پہنچائی۔ پہلے تو لوگ جامن کے پھلدار درخت کے گرنے پر افسوس کرتے رہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ اس کے نیچے ایک آدمی بھی دبا پڑا ہے۔ جو ابھی زندہ ہے۔ کلرک اور نچلے طبقے کے ملازم اسے درخت کے نیچے سے نکالنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ وہ ابھی خود معاملے کو ہاتھ میں نہ لیں۔ وہ پہلے انڈر سیکرٹری سے مشورہ کر لے۔ سپرنٹنڈنٹ مشورہ کے لیے انڈر سیکرٹری کے پاس گیا۔ انڈر سیکرٹری ڈپٹی سیکرٹری کے پاس، ڈپٹی سیکرٹری جوائنٹ سیکرٹری کے پاس اور جوائنٹ سیکرٹری چیف سیکرٹری کے پاس۔ چیف سیکرٹری نے جوائنٹ سیکرٹری سے کچھ کہا۔ جوائنٹ سیکرٹری نے ڈپٹی سیکرٹری سے بات کی۔ ڈپٹی سیکرٹری نے انڈر سیکرٹری سے اور یوں فائل چلتی رہی اور آدھا دن گزر گیا۔ نچلے طبقے کے ملازم اب بھی دبے ہوئے آدمی کو درخت اٹھا کر نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے انہیں خبردار کیا کہ یہ درخت ہٹانے کے وہ لوگ مجاز نہیں ہیں۔ کیونکہ معاملہ درخت کا ہے۔ یہ درخت محکمہ تجارت کے لان میں لگا تھا۔ لیکن درخت محکمہ زراعت کی تحویل میں تھا اس لیے سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ وہ فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمہ زراعت کو بھجو رہا ہے۔

دوسرے دن محکمہ زراعت سے جواب آیا کہ درخت چونکہ محکمہ تجارت کے لان میں ہے۔ اس لیے یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے کہ وہ درخت ہٹائے یا نہ ہٹا محکمہ تجارت والوں کو اس پر طیش آیا۔ فائل پر اور نوٹنگ ہوئی۔ دوسرے دن بھ فائل حرکت میں رہی اور جواب آیا کہ چونکہ درخت پھلدار ہے اس لیے ایگری کلچرل محکمہ اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ان کی حدود میں صرف اناج اور کھیتی باڑی کے معا آتے ہیں۔ اس لیے یہ فائل۔ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اس صحیح فیصلہ کر سکے۔

جامن کے درخت کے نیچے دبا ہوا آدمی سسکتا رہا۔

تیسرے دن ہارٹی کلچرل والوں کا جواب آیا کہ اس وقت جبکہ ہم درخت اگاؤ سکی

بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں۔ کسی حالت میں بھی اس پھلدار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

معاملہ الجھ گیا۔ اس موقع پر کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ اگر درخت کے نیچے دبے ہوئے آدمی کو عین بیچ سے دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے تو آدھا آدمی ادھر سے نکل آئے گا اور آدھا ادھر سے اور درخت کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا اس پر دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا کہ اس طرح تو میں مر جاؤں گا۔ جس پر اسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ آج کل پلاسٹک سرجری بڑے زوروں پر ہے اس لیے اس آدمی کا دھڑ پھر سے جوڑا جا سکتا ہے۔

درخت اور اس کے نیچے دبے ہوئے آدمی کی فائل اب میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دی گئی۔ اس محکمے نے فوراً ایکشن لیا اور دوسرے دن ہی پلاسٹک سرجن کو وہاں بھیج دیا گیا۔ جس نے اس آدمی کا طبی معائنہ کیا اور رپورٹ دی کہ اس آدمی کا پلاسٹک آپریشن تو ہو سکتا ہے لیکن یہ مر جائے گا۔

ایک غریب مالی اس دبے ہوئے آدمی کو اپنے ہاتھ سے کچھ کھلا دیتا تھا۔ اس مالی کے سامنے اس آدمی نے اپنی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے ایک شعر پڑھ دیا۔ اور مالی کے سوال کے جواب میں اقرار کر لیا کہ وہ شاعر ہے۔ اگلے دن سارے سیکرٹریٹ میں یہ بات پھیل گئی کہ جامن کے نیچے دبا ہوا شخص شاعر ہے۔

خبر سیکرٹریٹ سے شہر میں پھیلی۔ شاعر حضرات اور سیکرٹریٹ کے سخن فہم اور شعر سے ذوق رکھنے والے افسر اس دبے ہوئے آدمی کے پاس مجمع کی صورت میں جمع ہو گئے کوئی اس کو شعر سنا رہا تھا۔ کوئی اصلاحِ سخن پر آمادہ کر رہا تھا۔ لیکن اسے کوئی درخت کے نیچے سے نہ نکال رہا تھا۔ کہ فائل ابھی چل رہی تھی۔

سیکرٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس آدمی کا معاملہ۔ کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ شاعر ہے۔ اب فائل کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکادمی کے سیکرٹری کے پاس پہنچی جو کار پر سوار ہو کر سیکرٹریٹ پہنچا، دبے ہوئے شاعر سے ملا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ یہ دبا ہوا شاعر وہی ہے جس کا دیوان حال ہی میں شائع ہو کر دنیائے شعر میں تہلکا مچا چکا ہے تو ادبی اکادمی کے سیکرٹری تڑپ اٹھے کہ اتنا بڑا شاعر اور ابھی تک اسے اکادمی کی رکنیت نہیں ملی

درخت کے نیچے دبا ہوا آدمی مسلسل کراہ رہا تھا کہ اسے اس پھلدار درخت کے بوجھ سے نجات دلوائی جائے۔

دوسرے دن ادبی اکادمی کے سیکرٹری بھاگے بھاگے آئے۔ دبے ہوئے شاعر کو مبارک دی کہ اسے سرکاری ادبی اکادمی نے اپنا رکن بنا لیا ہے۔ بے چارہ دبا ہوا شاعر واویلا کرنے لگا کہ اس کی جان بچائی جائے۔ وہ آخری دموں پہ آ پہنچا تھا۔ سیکرٹری نے اسے کہا کہ یہ کام اس کے محکمے کا نہیں ہے۔ وہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ، کو ارجنٹ مارک کر کے فائل بھجوا رہا ہے کہ وہ آئیں اور آ کے اس درخت کو کاٹ کر تمہاری جان بچائیں۔

دبے ہوئے آدمی کی حالت نازک تھی۔ لیکن وہ زندگی کے لیے اب بھی لڑ رہا تھا۔ دوسرے دن جب فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی درخت کاٹنے کے لیے پہنچ گئے اور وہ درخت کاٹنے ہی والے تھے کہ دفترِ خارجہ کا ایک کارندہ حکم لے کر آ گیا کہ اس درخت کو کاٹا نہیں جا سکتا ہے۔ کیونکہ اسے ایک غیر ملک کے وزیرِ اعظم نے لگایا تھا۔ اگر اسے کاٹا گیا تو ہمارے اور اس غیر ملک کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ خواہ شاعر مرتا ہے یا زندہ رہے۔ درخت نہیں کاٹا جائے گا۔

وزیرِ اعظم دورے پر تھے وہ واپس آئے تو فائل ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے درخت کاٹنے کا حکم دے دیا۔ تاکہ شاعر کی جان بچائی جا سکے۔ سپرنٹنڈنٹ بھاگا بھاگا جامن کے درخت کے نیچے دبے ہوئے شاعر کے پاس پہنچا اور خوشی سے بولا۔

"آج تمہاری فائل مکمل ہو گئی ہے۔"

لیکن شاعر ——— مر چکا تھا!!

لیکن کبھی کبھی ہم روایت سے انحراف بھی کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم لکیر کے فقیر ہی نہیں ہیں۔ ہم بلکہ ہم یہ بھی حمایت کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری نیت (ٹھیک یا بد) ہو۔ تو ہم عجلت کا مظاہرہ بھی کر سکتے ہیں۔ بلکہ غیر ضروری عجلت کا نمونہ بھی پیش کر سکتے ہیں بھٹو کیس اور بھٹو کے معاملے میں فائل جلد ہی مکمل کر دی گئی۔

مارشل لا کی حکومت نے بھٹو کو مری میں نظر بند کیا۔ ۲۴ روز وہ مری میں اسیر رہے۔

"انتخاب" کا غلغلہ بلند ہوا۔ بھٹو نے بھی کاغذات داخل کرائے۔ لیکن انہیں محمد احمد خاں کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ درخواست ضمانت پیش کی گئی جسے مسٹر جسٹس صمدانی نے منظور کر لیا۔ لیکن اسی روز پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ایک درخواست پر درخواست دہندہ یا کسی اور کا موقف سُنے بغیر۔ مقدمہ کو سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا۔ اپنی سربراہی میں پانچ ججوں پر مشتمل ایک بنچ کو تشکیل دیا۔ مارشل لا حکومت نے جناب بھٹو کی ضمانت منسوخ کرنے کی درخواست دی۔ اور بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی گئی۔

بھٹو لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس پر عدم اعتماد کا بار بار اعلان کرتے رہے۔ لیکن مقدمہ چلتا رہا۔ ۱۸ مارچ کو پنجاب ہائیکورٹ نے انہیں قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو سپریم کورٹ نے بھی اپنا آخری فیصلہ دے دیا۔ (حالانکہ ۲۳ مارچ کو یومِ پاکستان کی رخصت جمعہ کو ہونے کی وجہ سے ۲۴ کو متبادل اور اصولی تعطیل تھی لیکن۔ کیس بہت لمبا کھنچ گیا تھا۔ اس لیے اس کا جلد فیصلہ کرنا ضروری تھا)

اور پھر کہیں رکاوٹ نہ پڑی۔ ہر فائل تیزی سے مکمل ہوتی چلی گئی۔ جناب بھٹو نے رحم کی اپیل نہ کی۔ لیکن ان کی جاں بخشی کے لیے کتنی ہی اپیلیں ملکی اور غیر ملکی سطح پر آ چکی تھیں۔ لیکن ہر اپیل کو جلدی سے نمٹا دیا گیا۔ اور پھر ۴ اپریل کو انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

بھٹو کی موت اور اس کے فیصلے کے سلسلے میں معروف اور بدنام زمانہ "سرخ فیتہ" اور سرکاری مصروفیات حائل نہیں ہوئیں۔ سرخ فیتہ۔ توڑ دیا گیا۔

فائلیں تیزی سے حرکت میں آ گئی تھیں۔ ہوائی جہازوں پر فائلوں کو سفر کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ کرشن چندر کی کہانی کا شاعر۔ تاخیر کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ اور بھٹو ——— !!

۲۲ اپریل ۱۹۷۹ء جنرل ضیاء الحق نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا:

"بھٹو کی فائل مکمل ہو گئی تھی۔ اس لیے سزا پر عمل درآمد کرا دیا گیا۔

اور پھر اس سے پہلے کہ غیر ملکی نامہ نگار کچھ کہتا۔ جناب جنرل ضیاء الحق نے خود ہی کہا:

"اس کے بعد کہ آپ یہ سوال کریں کہ ایک کو پھانسی کیوں دی گئی اور باقی چار مجرموں کو پھانسی کیوں نہیں دی گئی تو ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ بھٹو کی فائل مکمل ہو چکی اور اس پر غور کر لیا گیا تھا۔ باقی مجرموں کو اس لیے ابھی پھانسی نہیں دی گئی کہ ان کی فائلوں پر ابھی غور کیا جا رہا ہے۔ وہ اور کئی معاملات میں ملوث ہیں ....."

بھٹو کی فائل جلدی مکمل ہو گئی۔ اس پر اس ملک کی کئی عدالتوں میں کئی مقدمے چل رہے تھے۔ وہ "ہر برائی" میں ملوث ہونے کے باوجود۔ "ملوث" نہ رہا تھا۔ کیونکہ فائل پر غور کر لیا گیا تھا۔ ان کی ضرورت کسی معاملے میں اب باقی نہ رہی تھی۔ اور جو اس مقدمۂ قتل کے باقی چار مجرم ہیں۔ جنہیں پھانسی کی سزا کا حکم سنایا جا چکا تھا ان کی فائلیں ابھی نامکمل ہیں۔ اور وہ مجرم کئی اور معاملوں میں بھی ملوث ہیں، اس لیے.. ان کو پھانسی نہیں دی گئی۔ ان کا معاملہ زیرِ غور ہے۔

"غالباً معروف سرخ فیتے کی نذر ہو چکا ہے۔"!

تالی بجتی ہے

* * *

عوامی انداز میں، عوام میں گھل مل جانے کے لیے بھٹو نے اس ملک میں تالی بجانے کی رسم ڈالی تھی۔ بھٹو جس انداز میں تالی بجاتے تھے۔ اس کا انداز مختلف تھا۔

بھٹو۔ کرنل قذافی کے ساتھ

سلطان باہوؒ نے کہا تھا۔

تاڑی مار اڑا نہ باہو، اساں آپے ای اُڑ جاناں ہُو
(’’تالی بجا کر ہمیں نہ اڑاؤ باہو، ہم تو خود ہی اُڑ جانے والے ہیں‘‘)

سلطان باہو نے اس عارفانہ مصرع میں جو بات کہی ہے۔ وہ بڑی ابدی، ازلی اور اٹل ہے۔ اس ایک مصرع میں انہوں نے فنا کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ موت برحق ہے۔ ہر انسان فانی ہے۔ ہر ذی رُوح کو ایک نہ ایک دن اڑ جانا ہے۔ اس خاکداں سے اُٹھ جانا ہے۔ اور ’’اساں آپے ای اڑ جاناں ہُو......‘‘ سے پہلے ہلکی سی تنبیہہ کرتے ہیں کہ ’’ان کو تالی مار کر نہ اڑاؤ...... کہ جنہیں ایک دن خود ہی اُڑ جانا ہے......‘‘ وہ جن کے مقدر میں ہی مرنا، دنیا سے اُٹھ جانا اور اڑ جانا ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ تم انہیں تالی مار کر کیوں ’’وقت سے پہلے‘‘ اڑانے کی کوشش کرتے ہو۔

سلطان باہوؒ نے ایسی تالی بجانے سے منع کیا ہے!

اگر میں یہ کہوں کہ سلطان باہوؒ کا یہ مصرع انسان کے انسان پر جبر، انسان کی عجلت پسندی، مطلق العنانیت اور موت کی سزا کے خلاف ہے تو میرا خیال ہے کہ میں حضرت سلطان باہوؒ کا اس مصرعے کو غلط معنی پہنانے کا مرتکب نہیں ہوا۔

عفو، درگزر، انسانی جان کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کے تحفظ اور زندگی کی سب ایسی باتوں کے باوجود —— تالی بجانے والے تالی بجاتے ہیں اور بجاتے رہے ہیں۔

مجھے ژاں کوکتو کا ایک کھیل یاد آ رہا ہے۔ جب میں اس کھیل کو پڑھتے ہوئے ایک خاص مقام تک پہنچا تو میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ اس کھیل میں ژاں کوکتو نے ایک جدّت اور ایسی سوجھ سے کام لیا تھا جو پہلے شاید کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ ژاں کوکتو کے اس کھیل میں ’موت‘ کا بھی ایک کردار تھا۔ موت بھی ایک کردار کی طرح سٹیج پر آتی تھی اور ایک شخص کو اپنے گھاٹ اتارتی تھی۔ ژاں کوکتو نے اس میں جو نیا تجربہ جو نئی بات پیدا کی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے موت کے کردار کو ادا کرنے والے اداکار کو سامعین اور ناظرین کی قطاروں کے بیچ ایک سامع اور ایک ناظر کی طرح بٹھا دیا تھا۔ سامعین اور ناظرین میں بیٹھے ہوئے اس موت کے کردار کو ادا کرنے والے اداکار کے بارے میں کسی کو نہ کچھ بتایا جاتا تھا۔ نہ کسی کو اس کا علم ہوتا تھا۔ جب موت کا کردار ادا کرنے والا یہ اداکار عین ناظرین کی قطاروں میں سے اٹھ کر سٹیج کا رخ کرتا تھا تو ناظرین میں سنسنی دوڑ جاتی تھی۔ وہ یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ موت ان کے درمیان موجود ہے۔ ان کے ساتھ کندھے سے کندھا لگائے کھڑی ہے۔

میں نے وہ کھیل نہیں دیکھا۔ اس حقیقی سنسنی کا تجربہ خود نہیں کیا۔ لیکن ڈرامہ پڑھتے وقت میں بھی لرز گیا تھا اور کافی دیر تک اس کھیل کو آگے نہ پڑھ سکا تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا تھا کہ جب پہلی بار رات یہ کھیل کھیلا گیا ہو گا تو دیکھنے والوں میں موت کی اس غیر متوقع ENTRY سے کتنی سنسنی پھیلی ہو گی۔ اور پھر اس کھیل پر تبصرے ہوتے ہوں گے۔ اس کھیل کی اس جدّت اور اپروچ کو بطور خاص سراہا گیا ہو گا اور لوگوں میں اس کھیل کو دیکھنے کا کتنا اشتیاق پیدا ہوا ہو گا اور اس کھیل کی ہر رات کو اسی پہلی جیسی سنسنی کو کس طرح برقرار رکھا گیا ہو گا۔

میں نے ان کرداروں کی پیش کش اور ہدایت کاری کے بارے میں ایک اندازہ لگایا۔ جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ ژاں کوکتو اس کھیل کا صرف خالق اور مصنف ہی نہ تھا بلکہ اس کھیل کا پیش کار اور ہدایت کار بھی تھا۔ اس نے اس کھیل کے اس حصے کی سنسنی اور موت کو غیر متوقع اور انہونی دکھانے کے لیے بڑی خلاقی اور ’’پتے بازی‘‘ سے کام لیا تھا اور موت کا کردار ادا کرنے والے اداکار کو ہر روز کسی نئی جگہ کسی نئی قطار میں بٹھا دیتا تھا۔ یوں موت ہر ناظر کی توقع کے برعکس، اچانک، غیر متوقع انداز اور جگہ سے نمودار ہوتی تھی۔

اس کردار کو ادا کرنے والے اداکار کو بھی یہ علم نہ ہوتا تھا کہ کل اسے کس جگہ بٹھایا جائے گا۔ صرف ہدایت کار ژاں کوکتو کو علم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے کردار کو کہاں بٹھانا ہے اور وہ جب اس کی باری آتی تھی۔ اشارہ کرتا تھا (گویا تالی بجتی تھی) اور وہ کردار سٹیج پر آ جاتا تھا......

سلطان باہو نے ایسی تالی بجانے سے منع کیا تھا۔ بڑے نرم لہجے میں، لیکن تالی بجانے والے تالی بجاتے ہیں۔ اور یہ ان کو ہی پتہ ہوتا ہے کہ کب تالی بجائی جائے گی، لیکن بعض اوقات ان کے تالی بجانے کے عمل کی شدت اور عجلت کا بھرم کھل جاتا ہے اور اس سنگین اور سفاک حقیقت کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات دراصل تالی بہت پہلے بج چکی ہوتی ہے اور تالی بجانے والے ہاتھ کی تالی کی آواز دیر سے سنائی دیتی ہے۔

یہ دو اقتباسات ذرا غور سے پڑھیے!

دعوےٰ مجیب الرحمٰن شامی کا ہو تو اُسے جھٹلایا نہیں جاسکتا

"ایک خبر تھی کہ ۲ر اپریل کی شام کو نمازِ مغرب پڑھنے کے بعد پاکستان کے فوجی حکمران نے رحم کی اپیلیں حتمی طور پر مسترد کر دی تھیں اور فیصلہ کر لیا تھا کہ سب سے پہلے مسٹر بھٹو کو پھانسی دی جائے گی اور اس کے بعد باقی مجرموں کو' چنانچہ پھانسی لگانے کے انتظامات شروع کر دیئے گئے تھے

(میں نے بھٹو کو پھانسی چڑھتے دیکھا : ہفت روزہ "بادبان" صفحہ ۶ شمارہ ۷ر اپریل ۷۹)

اب دوسرا اقتباس پڑھیئے۔ یہ تارا مسیح کا انٹرویو ہے۔ تارا مسیح، جس نے بھٹو کو پھانسی دی۔ تارا مسیح کہتا ہے:

"جناب! میں یکم اپریل کو بہاول پور میں اپنا کام ختم کر کے ملتان پہنچا تھا کہ لاہور سے اطلاع آئی کہ تارا کو فوراً یہاں بھیج دو۔ ملتان سے میں ریل گاڑی کے ذریعے یہاں آیا اور کوٹ لکھپت جیل میں آکر رپورٹ دی اور جونہی میں جیل کے اندر گیا اور سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا تو دوبارہ جیل سے باہر آنے کو منع کر دیا گیا۔ یہ دو اپریل کا دن تھا۔ میں اس روز باہر نہیں نکل سکا اور نہ گھر آ سکا۔ مجھے بتایا گیا کہ تمہیں ضروری کام کے لیے روکا گیا ہے۔ اسی شام راولپنڈی سے آئی جی صاحب (انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات) کا فون آیا کہ تارا مسیح کو آج ہی پنڈی پہنچایا جائے۔ مجھے بتائے بغیر لاہور سے پنڈی جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا گیا تھا۔ لیکن میں نے جہاز میں سفر کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں نے زندگی میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا اور مجھے ہوائی جہاز کے سفر سے خوف آتا تھا۔ میری درخواست پر سپرنٹنڈنٹ جیل نے ایک ہیڈ وارڈن کے ساتھ مجھے ویگن کے ذریعے راولپنڈی بھیج دیا۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ میرے ساتھ ایک وارڈن کو بھیجا گیا اور میری روانگی کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ حتیٰ کہ میرے گھر والوں کو بھی خبر نہ مل سکی تھی۔

رات کے پچھلے پہر یعنی ۲- اور تین اپریل کی درمیانی شب ہم راولپنڈی پہنچے وہاں ڈسٹرکٹ جیل میں رپورٹ کرنا تھی۔ مجھے فوراً ہی جیل کے اندر بڑے دروازے کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں بند رکھا گیا اور باہر آنے سے منع کر دیا گیا۔

("میں نے بھٹو کو پھانسی دی"۔ تارا مسیح سے پہلا انٹرویو۔
ہفت روزہ "صحافت" صفحہ ۷ شمارہ ۱۸ر اپریل ۱۹۷۹ء)

ہفت روزہ "بادبان" نے "میں نے بھٹو کو پھانسی چڑھتے دیکھا" رپورٹ کی اشاعت پر جہاں یہ دعویٰ کیا کہ۔ یہ "پہلی چشم دید رپورٹ" ہے وہاں اس رپورٹ کی صداقت اور سچائی کو مستند بھی بنایا ہے۔ اس رپورٹ پر جو ادارے کی طرف سے تعارفی سطور (Introductory lines) لکھی گئی ہیں۔ وہ بھی ذرا پڑھ لیجیے۔

"مسٹر بھٹو کی پھانسی پر۔ پہلی چشم دید رپورٹ"

"مسٹر بھٹو کو جب پھانسی دی گئی تو ان کا رویہ کیا تھا۔ جب پھانسی کی خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے کیسے رد عمل کا اظہار کیا۔ مسٹر بھٹو کے آخری ایام کے پس منظر میں ان تاریخی لمحات کی یہ اولین مصدقہ اور تفصیلی رپورٹ ہے۔ یہ اس کا راوی وہ اعلیٰ افسر ہے جو آخری مراحل کے دوران خود موقع پر موجود رہا۔ اور دوسرے مراحل کی اس سے زیادہ تصدیق شدہ رپورٹ کسی کے پاس ہو ہی نہیں سکتی۔

"ہم اس افسر کا نام' خود اس کی خواہش پر شائع نہیں کر رہے اور یہی صحافتی اخلاق کا تقاضہ ہے۔ لیکن اس رپورٹ کو جھٹلانا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ یہ پاکستان کے اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے والی پہلی چشم دید روداد ہے۔ اسے "بادبان" کے لیے جناب ہارون الرشید نے مرتب کیا (ایڈیٹر)

(ہفت روزہ "بادبان" صفحہ۔ شمارہ ۷ر اپریل ۱۹۷۹ء)

ہفت روزہ "بادبان" کی یہ چشم دید رپورٹ۔ ادارہ "بادبان" کے بقول اس قدر مقبول ہوئی کہ اُسے قارئین کرام کے اصرار پر دوسرے شمارے میں پھر شائع کیا گیا۔

اس رپورٹ کی ان تعارفی سطور میں اس کی صداقت اور استناد پر زور دیا گیا ہے اور پھر ایڈیٹر "بادبان" یہاں تک کہتے ہیں کہ اس رپورٹ کو جھٹلانا کسی طور پر بھی ممکن نہیں"۔ ہم اس دعوے کو مستند اور صحیح تسلیم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایڈیٹر کا دعویٰ ہے۔ جو ایک انتہائی ذمہ دار فرد ہوتا ہے اور پھر جب ایڈیٹر جناب مجیب الرحمان شامی جیسی شخصیت ہو تو پھر واقعی اس دعوے کو جھٹلانے کی کون ہمت کر سکتا ہے کہ ان کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔

دوسری طرف "صحافت" کا وہ انٹرویو ہے جو اس دعوے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے کہ یہ تارا مسیح کا ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء (یعنی بھٹو کو پھانسی لگنے کے دن) کے بعد پہلا انٹرویو ہے جو بھٹو کے جلاد "تارا مسیح" سے کیا گیا۔

ایک طرف ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہے۔ جس کی رپورٹ سے زیادہ تصدیق شدہ رپورٹ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور اس رپورٹ کے مستند اور مصدقہ ہونے کی گواہی جناب مجیب الرحمٰن شامی ایڈیٹر "بادبان" دیتے ہیں۔

دوسری طرف "تارا مسیح" ہے جو بھٹو کا جلاد ہے۔ لیکن ان دونوں رپورٹوں اور انٹرویو میں ایک ایسا تضاد ہے جس نے اپنی اپنی صداقتوں کو ثابت کرتے ہوئے ایک "تیسری" چیز کا انکشاف کیا ہے۔ ہفت روزہ "بادبان" کی چشم دید رپورٹ کا وہ اقتباس پڑھیے جو یہاں درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تارا مسیح کا انٹرویو کا وہ حصہ جسے ہم نے یہاں نقل کیا ہے تو پھر آپ پر بھی وہ انکشاف ہو جائے گا جو ہم پر ہوا ہے۔

"بادبان" کی مصدقہ اور مستند رپورٹ میں بتایا گیا ہے:

پاکستان کے فوجی حکمران جناب جنرل ضیاالحق نے ۲ر اپریل ۷۹ء کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد رحم کی اپیلیں مسترد کیں اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ سب سے پہلے بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ جنرل ضیاالحق کے اس فیصلے کے فوری بعد' جیل میں بھٹو کو پھانسی دینے کے انتظامات کی تیاری ہونے لگی۔ یہاں بعض ایسے امور کا تذکرہ ضروری ہے جو اہم پس منظر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست کو ۲۴ر مارچ کو مسترد کیا اس کے بعد سات دن رحم کی اپیل کے وقفے کے تھے۔ ۳۱ر مارچ کو رحم کی اپیل کرنے کی میعاد ختم ہوتی ہے۔ پنجاب کے فوجی گورنر نے اپنی کارروائی بڑی تیزی سے مکمل کر لی اور ۲ر اپریل کی شام کو بعد از نماز مغرب' جنرل ضیاالحق نے ان اپیلوں اور مجرموں کی قسمت کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ اپیلوں کو رد کرنے کی تمام تر ذمہ داری فوجی حکمران جنرل ضیاالحق پر تھی کیونکہ انہیں ہی یہ قانونی حق حاصل تھا اور کوئی دوسرا اس کا مجاز نہ تھا۔ جنرل ضیاالحق نے ادھر اپیلیں مسترد کیں' بھٹو کو پہلے پھانسی لگانے کا فیصلہ کیا اور اُدھر فوری طور پر بھٹو کو پھانسی لگانے کے انتظامات کیے جانے لگے اس میں عجلت کا عنصر اور رجحان صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کے سربراہ یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ یہ ہم نہیں کہتے۔ یہ وہ نتیجہ ہے جو اس رپورٹ سے اخذ ہوتا ہے۔

بعد از مغرب فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے بعد جن لوگوں سے اس فیصلے پر عمل کرانا ہے انہیں اطلاع دے دی جاتی ہے کیونکہ اگر انہیں اس فیصلے کی اطلاع جو صرف ایک فردِ واحد کے اختیار میں تھا' نہ دی گئی ہوتی تو وہ ۲ر اپریل کو ہی پھانسی دینے کے انتظامات کیسے شروع کر سکتے تھے۔

آپ کے ذہن میں ہفت روزہ "افریشیا" میں چھپنے والی رپورٹ بھی ہو گی کہ جس میں "افریشیا" کے ایڈیٹر عبدالقادر حسن نے یہ لکھا تھا کہ بھٹو کو "تین اپریل کو ہی پھانسی دی جانے والی تھی۔ لیکن

۲ اپریل کو نمازِ مغرب پڑھنے کے بعد جنرل ضیاالحق نے رحم کی اپیلیں مسترد کر دیں

ایک تو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے علالت کا عذر کیا اور دوسری اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ کا موسم انتظامات کی تکمیل کی راہ میں مزاحمت کر رہا تھا۔ اس لیے چار اپریل کو پھانسی دی گئی۔ اب ذرا اس رپورٹ کا موازنہ اس بڑے افسر کی رپورٹ سے کیجئے جس کی تصدیق ایڈیٹر "بادبان" کرتے ہیں۔

اگر تین اپریل کو پھانسی دینا مقصود تھا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲ اپریل کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو بھٹو سے آخری ملاقات کے لیے کہا گیا لیکن بڑے افسر کی رپورٹ میں خبر یہ بتائی گئی ہے کہ ۲ اپریل کو بعد از نمازِ مغرب جنرل ضیاالحق نے ان اپیلوں کو مسترد کیا اور بھٹو کو سب سے پہلے پھانسی لٹکانے کا حکم صادر کیا۔

اگر فیصلہ ۲ اپریل کو بعد از نماز مغرب ہوا، تو پھر بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ۲ اپریل کو کس وقت بھٹو سے آخری ملاقات کرنے کے لیے کہا گیا ——؟

یعنی آخری فیصلے سے پہلے ہی بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو آخری ملاقات کے لیے کہا گیا تھا!

جناب عبدالقادر حسن ایڈیٹر "افریشیا" اور بڑے افسر کی ہفت روزہ "بادبان" میں چھپنے والی پہلی چشم دید اور مصدقہ رپورٹ سے جو گھپلا پیدا ہوتا ہے اُسے ابھی یہیں تک رکھئے اور تارا مسیح کا بیان سنئے۔

بھٹو کا جلّاد —— تارا مسیح نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ اُسے تو یکم اپریل کو ہی بلوا لیا گیا تھا۔ وہ بہاولپور سے "کام" ختم کر کے ملتان پہنچتا ہے اور یہاں لاہور سے اطلاع آتی ہے کہ فوراً لاہور بھجوا دیا جائے۔ وہ ملتان سے ریل گاڑی کے ذریعے لاہور پہنچتا ہے۔

یعنی چھ سات گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ سیدھا کوٹ لکھپت پہنچتا ہے وہ لاہور پہنچ کر اپنے گھر نہیں جاتا۔ سیدھا کوٹ لکھپت جیل جا کر رپورٹ دیتا۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ ۲ اپریل کا دن ہے۔ ۲ اپریل کا سارا دن اُسے جیل میں روکا گیا (آخر کیوں —— بڑے افسر کی مصدقہ اور مستند رپورٹ کے مطابق تو جنرل ضیاالحق ۲ اپریل ۷۹ء کو بعد از نمازِ مغرب فیصلہ کرتے ہیں پھر تارا مسیح کو یکم اپریل کو ہی ملتان سے لاہور کیوں طلب کیا گیا اور ۲ اپریل کو سارا دن اُسے جیل میں کیوں روکے رکھا گیا؟ کیا جیل کے حکام غیب بین تھے؟ کیا انہیں پہلے سے جنرل ضیاالحق کے آخری فیصلے سے پہلے ہی فیصلے کا پتہ چل چکا تھا)

تارا مسیح ۲ اپریل کو سارا دن جیل میں رہتا ہے۔ شام کو (اب شام سے صحیح واضح نہیں کہ مغرب سے پہلے یا بعد) آئی جی صاحب کا فون آتا ہے کہ تارا مسیح کو فوراً راولپنڈی بھیجا جائے۔ اسی فوراً میں جو عجلت ہے۔ جو شدت اور بے چینی ہے اُسے دور کرنے کے لیے تارا مسیح کو بذریعہ ہوائی جہاز لاہور سے راولپنڈی بھیجا جاتا ہے۔

مگر تارا مسیح ہوائی جہاز کے سفر کا عادی نہیں وہ ہوائی جہاز سے خائف ہے۔ اُسے راولپنڈی جلدی پہنچانے کے لیے ویگن کے ذریعے راولپنڈی بھیجا جاتا ہے اس کے ساتھ ہیڈ وارڈن بھی ہے اور خود تارا مسیح کو حیرت ہے کہ پہلے اُس کے ساتھ کبھی کسی کو نہ بھیجا جاتا تھا۔ اس کی روانگی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ وہ رات کے پچھلے پہر یعنی ۲ اپریل اور تین اپریل کی درمیانی شب راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں رپورٹ کرتا ہے اور اُسے وہاں فوراً بند کر دیا جاتا ہے.....

ان معتبر گواہوں اور بیانوں میں جو باہمی تضاد ہے۔ اُس کو دیکھیئے غور کیجئے تو الجھن ہونے لگتی ہے

بڑے سرکاری افسر۔ چشم دید گواہ کی رپورٹ

فیصلہ ۲ اپریل کو بعد از نماز مغرب ہوا۔

عبدالقادر حسن اپنی رپورٹ میں کہتے ہیں کہ بھٹو کو پھانسی ۳ اپریل کو دی جانی تھی۔ لیکن سندھ کے موسم کی ناسازگاری آڑے آئی۔ گویا اگر تین کو پھانسی دی جاتی تھی کہ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ۲ تاریخ کو آخری ملاقات کے لیے کہا گیا۔

جبکہ جنرل ضیاالحق نے فیصلہ ۲ اپریل کو بعد از نماز مغرب کیا تھا!

اور تارا مسیح کو یکم اپریل کو ہی طلب کر لیا گیا اور دو اپریل کی شام کو اُسے راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ ۲ اپریل کو اُسے سارا دن جیل میں روکے رکھا گیا۔

لیکن مصدقہ سرکاری افسر کی رپورٹ تو کہتی ہے کہ جنرل ضیاالحق نے فیصلہ ۲ اپریل کو بعد از نماز مغرب دیا۔ اب ان میں مصدقہ رپورٹوں اور ان گواہوں میں سے کون جھوٹا اور کون غلط ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، ہم نے تو ساری گواہیاں سامنے رکھدی ہیں اور جو تضاد ہے اُسے نمایاں اور واضح کر دیا ہے۔

جلّاد تارا مسیح
کو جیل میں
روک لیا گیا

اور ہم جس فیصلے پر پہنچے ہیں وہی آپ کا فیصلہ ہوگا۔ بات صرف سوچنے اور غور کرنے کی ہے۔

اور وہ یہ کہ۔ دراصل "تالی بہت پہلے بج گئی تھی۔ بھٹو کو پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ بہت پہلے بہت پہلے کر لیا گیا تھا۔ سب تیاریاں ہی بہت پہلے ہو چکی تھیں۔

ہاں "تالی بجنے کی آواز ذرا دیر سے سنائی دی!

اور تالی بجانے والے ہاتھ نے "تالی بجا کر سلطان باہوؒ کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا ہے

"تاڑی مار اڈا امت باہوؒ اساں آپے ای اڈ جاناں ہُو!!

اس مصرعے پر پھر غور کیجئے!!

* * *

پاکستان
قومی
اتحاد
وایا
مارشل لا

"ڈی پرفیکٹ
جنٹلمین"

پاکستان قومی اتحاد ۔ بنا تو یہ نوَ سیاسی جماعتوں پر مشتمل تھا۔ ان نوَ سیاسی جماعتوں میں بعد القطبین تھا۔ اس میں وہ جماعتیں بھی شامل تھیں جن کے رہنماؤں نے تحریکِ پاکستان۔ قیام پاکستان اور قائد اعظم کی شدید مخالفت کی تھی۔ ان میں وہ سیاسی جماعتیں اور ان کے وہ سیاسی سربراہ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے کبھی ایک دوسرے کو کافر قرار دیا تھا اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عائد کئے تھے۔ ان میں وہ سیاسی جماعتیں بھی شامل تھیں جن کو کبھی انتخابات میں "تسلّی بخش" کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اس میں وہ سیاسی جماعتیں بھی تھیں۔ جن کے نزدیک انتخابات میں حصہ لینا کبھی جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس میں ایسی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ جو 'مذہبی اجارہ داری' کا سا رویّہ بھی اپنائے ہوئے تھیں۔ ان میں ایسی سیاسی جماعتیں بھی تھیں۔ جن کے اغراض و مقاصد اور بنیادی پالیسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ خالص مذہبی نقطۂ نگاہ کی جماعتوں نے خالص سیاسی جماعتوں سے بھی اتحاد کیا۔ اور اس میں ایسی سیاسی جماعتیں بھی شامل تھیں اور ان سے اُن مذہبی اور دینی نقطۂ نگاہ رکھنے والی جماعتوں نے بھی تعاون کیا۔ جو سیکولر (لادینی) حکومت کا مطالبہ کرتی تھیں۔

ان سیاسی جماعتوں کا یہ اتحاد عجیب و غریب، ناممکن اور محیرالعقول تھا۔ ان جماعتوں کا اتحاد ایک بڑے "معجزے" سے کم نہ تھا۔ لیکن یہ معجزہ ہو کر رہا۔ ایک دوسرے سے اس حد تک سیاسی اور مذہبی اختلافات رکھنے والی جماعتوں کا اتحاد کیسے ہوا؟ اس کا دلچسپ جواب۔ تو اسے حمید کے حوالے سے دیا جا سکتا ہے اے۔ حمید کے ناول "ڈربے" میں کہیں دو اندھے گداگروں کا ذکر آیا ہے۔ وہ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک اندھا گداگر کہتا ہے۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں!"

دوسرا گداگر فوراً جواب دیتا ہے "لیکن جب چاول کھانے ہوں تو پانچوں انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں"

سو۔ ان نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد (جو بعد میں پارہ پارہ ہوا) اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اس لیے ممکن ہو گیا کہ۔ وہ سب چاول کھانا چاہتے تھے۔ اس لیے سب انگلیاں برابر ہو گئیں۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس مثال سے بات میں مزاح پیدا ہو گیا ہے تو سیدھی سادی بات یوں ہے کہ ان سیاسی جماعتوں کا اتحاد اس لیے ہوا کہ تمام تر مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باوجود ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ اور وہ تھی۔ بھٹو دشمنی۔

اس بھٹو دشمنی کے پیچھے اقتدار پر فائز ہونے کی خواہش بھی موجود تھی۔ جس کے بارے میں بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ بھٹو جیسے شخص کے سامنے ان کا چراغ نہ جلے گا اور وہ شاید کبھی اقتدار حاصل نہ کر سکیں۔

بہرحال ان نو ستاروں کا اجتماع ہوا۔ ایک پرچم بنا۔ (ستارے ٹوٹتے گئے۔ بکھرتے گئے۔ لیکن کہا گیا کہ ہمارے پرچم پہ نو ستارے ہی براجمان رہیں گے) اور یوں پاکستان قومی اتحاد معرض وجود میں آیا۔ اور اس نے اپنی مشترکہ کاوشوں سے بھٹو کی حکومت کے خلاف انتخابی معاہدہ کیا۔

یار لوگ جو پہلے ہی اس عجیب و غریب اتحاد سے حیران تھے۔ ان کے دلوں میں یہ بات کھٹکنے لگی کہ اگر کسی طرح جو لوگ برسرِ اقتدار آ گئے تو حکومت میں کس طرح "حصّہ" لیں گے۔ اور کی جماعت۔ حصّہ کتنا ہو گا۔ اور ان کے اختلافات کس طرح سے دُور ہوا کریں گے اور جو کھچڑی ان کے درمیان پکے گی اس کا اثر ملک کی بقا اور استحکام پر کیا ہو گا؟

جناب رفیق احمد باجوہ۔ پاکستان قومی اتحاد کے جنرل سیکرٹری تھے۔ جب انہیں "بڑا بے آبرو" کر کے اتحاد سے نکالا گیا۔ تو اس کے کچھ عرصے کے بعد ہم نے ان سے ملاقات کی۔ طویل نشست رہی۔ "سیارہ ڈائجسٹ" کے لیے

ان کا انٹرویو مقصود تھا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے بہت سی "آف دی ریکارڈ" باتیں بھی بتائیں۔ بعد میں ان کی ہدایت پہ یہ انٹرویو شائع نہ کیا گیا۔ میرے پاس اس کے نوٹس اب بھی موجود ہیں اور اس باب میں چند باتیں۔ جن کا ذکر آتا ہے۔ اس کے گواہ مظفر محمد علی ہیں جو 'سیارہ ڈائجسٹ' میں میرے رفیق بھی تھے اور اس انٹرویو کے وقت وہاں موجود تھے)

جناب رفیق احمد باجوہ اس اتحاد کا اپنے آپ کو بانی اور محرک بتاتے ہیں۔ اپنی کوششوں کا نتیجہ۔ وہ پاکستان قومی اتحاد کو قرار دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہی کے گھر۔ پاکستان قومی اتحاد کی نیو اٹھائی گئی اور انہی کے گھر پہ اس کا منشور تیار کیا گیا جبکہ قومی اتحاد میں شامل بعض رہنما مصر تھے کہ ہمیں منشور کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن اور اسلام کا نام ہی ہمارے لیے کافی ہے . . .

اس بات سے کوئی مؤرخ اور کوئی صحافی انکار نہ کر سکے گا کہ جناب بھٹو نے جمہوری عمل برقرار رکھنے کے لیے خود، ۱۹۷۷ء میں انتخابات کا اعلان کیا تھا۔ اور ابھی ان کے عہدے کی میعاد ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس سے بہت پہلے انہوں نے پاکستان میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا تھا۔ بھٹو نے یہ اعلان کسی عوامی دباؤ یا سیاسی ہنگاموں کی دھونس میں نہیں کیا تھا۔ ان کا اپنا تجزیہ تھا۔ اور اپنی مرضی سے انہوں نے اس کا اعلان کیا تھا۔ بھٹو حکومت نے پاکستان قومی اتحاد (نو جماعتوں کے اتحاد) کو قبول کیا۔ انہیں مشترکہ انتخابی نشان بھی دے دیا گیا۔ اور پھر وقتِ مقررہ پہ انتخابی مہم آغاز ہوا۔

نو ستاروں کا اجتماع۔ نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد۔ پاکستانی عوام کے لیے ایک نئی بات تھی۔ پھر حکومت نے ان جماعتوں کو انتخابی مہم چلانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی۔ پاکستان قومی اتحاد کے جلسوں میں لاکھوں انسان شریک ہوتے تھے سامعین کی اس کثرت نے قومی اتحاد کے کئی لیڈروں کا ذہن چکرا دیا۔ اور وہ کچھ 'مغرور' بھی ہوئے۔ اور انہوں نے انتخابات سے پہلے ہی اپنی جیت کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا بھی شروع کر دیا کہ اگر انتخابات کے نتائج ان کی مرضی کے خلاف نکلے تو وہ اسے قبول نہ کریں گے۔

جناب رفیق باجوہ راوی ہیں کہ اس کے باوجود۔ قومی اتحاد کے رہنما خوفزدہ تھے اور ان کے گھر پہ قومی اتحاد کے رہنماؤں کا پسندیدہ موضوع یہ تھا کہ بھٹو کو کس حربے سے اقتدار سے علیحدہ کیا جائے۔ ایک صاحب۔ جو نئے نئے اتحاد میں شامل کیے گئے تھے اور جو ایسے ٹائیگر تھے کہ وہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ انہوں نے اپنی باکمال بصیرت کا یوں ثبوت فراہم کیا تھا کہ انہوں نے قومی اتحاد کے رہنماؤں کو مشورہ دیا۔ کہ ایک خوبصورت اور چالاک عورت تلاش کی جائے اور اسے کسی طرح بھٹو کے ہاں پہنچا دیا جائے۔ "بھٹو شرابی اور بدکار ہے"۔ وہ اس عورت سے متاثر ہو گا۔ اور یہ عورت بھٹو کو شراب میں زہر ملا کر پلا دے۔ سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ "شرابی اور بدکار" کو ٹھکانے لگانے کے لیے انہوں نے جو ترکیب پیش کی تھی۔ وہ "عمل صالح" پر مبنی تھی۔ ۔

پاکستان قومی اتحاد کے بعض سرکردہ رہنما۔ انتخابی جلسوں میں بھٹو کی دھجیاں بکھیرنے کے ساتھ اخلاق اور شرافت کا جنازہ بھی نکالتے رہے۔ اس دور میں بعض رہنماؤں نے ذو معنی اور مبتذل تقریریں کرنے میں بڑا نام پیدا کیا اور انہوں نے بھٹو کو ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے مجمع میں۔ گالیاں دیں۔

حالانکہ وہ ایسا نظام لانے کے داعی اور علمبردار تھے۔ جس میں کسی بدتر انسان کو بھی گالی دینے کی اجازت نہیں۔

بھٹو حکومت۔ پاکستان قومی اتحاد کی اس مقبولیت پہ یقیناً ہراساں ہوئی اور اس حکومت نے بھی وہی کچھ کیا جو ہمارے ملک کی دیرینہ روایت رہی ہے کہ مخالفوں کو کسی طور پر بھی نمایاں نہ کیا جائے۔ پاکستان ٹیلیویژن پر بھٹو کے جلسوں کو خوب فلیش کیا جاتا تھا۔ جبکہ پاکستان قومی اتحاد کے جلسوں کو 'مختصر' اور محدود بنا کر دکھایا جاتا تھا۔ اور جہاں بھٹو کو ٹی وی کی سکرین پہ انتخابی جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے دکھانے کے ساتھ ساتھ سنوایا بھی جاتا تھا۔ وہاں پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کو گنگ اور خاموش دکھایا جاتا تھا۔

ہر باشعور شخص یہ تسلیم کرے گا کہ بھٹو کے عہد میں۔ انتخابات کے زمانے میں ریڈیو اور پاکستان ٹی وی کے عوامی اداروں پہ پابندیاں تھیں کہ وہ پاکستان قومی اتحاد کے جلسوں کی صحیح رپورٹنگ نہ کریں اور اس کو پوری طرح فلیش کریں۔

زیادتی۔ زیادتی ہوتی ہے خواہ اسے کوئی کرے !

انتخابات کے جو نتائج سامنے آئے۔ وہ پاکستان قومی اتحاد کو قبول نہ تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ پہلے سے اعلان کر چکے تھے کہ اگر انتخابات ان کے حق میں یقینی نہ ہوئے۔ اور اور ان کی مرضی کے خلاف نکلے تو وہ اسے قبول نہ کریں گے اور پھر انہوں نے دھاندلیوں کا الزام بھی لگایا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انتخابات میں دھاندلیاں ہوئی تھیں لیکن پاکستان قومی اتحاد نے جس طرح ان دھاندلیوں میں مبالغہ کا عنصر شامل کیا، وہ محل نظر تھا۔ کیونکہ اس حقیقت کے باوجود کہ دھاندلیاں ہوئی تھیں، دھاندلیاں اس پیمانے پہ نہیں ہوئی تھیں کہ پیپلز پارٹی انتخابات میں اکثریتی پارٹی قرار نہ پاتی۔ زیادہ سے زیادہ اسے دس سے بیس نشستوں کو کھونا پڑتا اور اگر ان علاقوں میں RE - ELECTION کا اعلان کر دیا جاتا، تو صورتِ حال واضح ہو کر سامنے آجاتی۔ لیکن کھیل بگڑ چکا تھا !

جناب رفیق احمد باجوہ اور قومی اتحاد کے دوسرے سیاسی لیڈروں نے بھی "درونِ خانہ" اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ جو دھاندلیاں ہوئیں۔ وہ اس پیمانے اور سطح پہ نہ تھیں کہ پیپلز پارٹی واضح اکثریت کے ساتھ حکومت نہ بنا سکتی۔ صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اور پھر پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے احتجاجی تحریک کا آغاز ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی ۱۹۷۷ء کے الیکشنوں میں نہ تو ناکام ہوئی تھی اور نہ ہی قوم نے اسے رد کیا تھا۔ وہ واضح اکثریت کے ساتھ جیتی تھی۔ لیکن پاکستان قومی اتحاد والے۔ اس مسئلے کو۔ اہمیت دے چکے تھے اور پھر ان کے پاس ایک بہت مؤثر بہت جذباتی نعرہ تھا۔ نظام مصطفیٰ کا نعرہ۔

رفیق باجوہ۔ جو اس نعرے کے خالق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہیں قومی اتحاد نے نہ صرف یہ کہ۔ جنرل سیکرٹری کے عہدے سے ہٹا دیا۔ بلکہ بنیادی رکنیت سے بھی محروم کر دیا آخر کیوں ؟

ایک الزام یہ ہے کہ وہ چوری چوری بھٹو سے ملاقات یا سودا کرنے لگے تھے۔

ایک الزام یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کے خلاف سازش کی تھی۔

جناب رفیق احمد باجوہ کہتے ہیں کہ انہیں اس لیے علیحدہ کیا گیا کہ ان کے خلاف سازش کی گئی تھی اور یہ سازش اس لیے کی گئی تھی کہ پاکستان قومی اتحاد کے رہنما ان کی مقبولیت سے جلنے لگے تھے۔ اور وہ نظام مصطفیٰ کے سلسلے میں چونکہ کسی لچک اور مصالحت کی گنجائش نہ پیدا کرتے تھے اس کے بھی انہیں ناپسند کیا جا رہا تھا۔ جناب باجوہ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ انہوں نے اس دور میں ان رہنماؤں کے اصلی چہرے بھی دیکھ لیے ہیں اور ان کی جہالت کا پول بھی ان پہ کھل گیا تھا۔

پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کو یہ تکلیف بھی تھی کہ جناب باجوہ نے یہ اعلان کیوں کیا تھا کہ اگر بھٹو ملک میں نظام مصطفیٰ نافذ کر دے تو تحریک اور اتحاد کو ختم کر دیا جائے گا۔ جناب باجوہ سے یہ بھی شکایت تھی کہ وہ تمام تر خامیوں کے باوجود بھٹو کو کلمہ گو مسلمان سمجھتے تھے اور اس سے بقول ان کے۔ بھلائی اور نیکی کی توقع رکھتے تھے اور وہ بھٹو سے مایوس نہ ہوئے تھے !

اور ان کے بھٹو سے اختلاف۔ نظریاتی اور اصولی تھے۔ ذاتی دشمنی نہیں تھی !

کل جو بات رفیق باجوہ کہتے تھے۔ آج وہی بات اس ملک کے لاکھوں کروڑوں انسان کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے بھی پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کے چہرے دیکھ لیے ہیں۔

اس موقع پہ مجھے ایک افریقی کہانی یاد آ رہی ہے۔ وہ افریقہ جو غلامی سے آزاد ہوا ہے جو آج بھی سیاسی آویزشوں کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ اس افریقہ میں جو نیا ادب تخلیق ہو

رہا ہے۔ وہ بڑا توانا ہے اور اس میں گہری رمزیت کے ساتھ آفاقیت بھی ملتی ہے۔ یہ کہانی جسے مختصراً پیش کر رہا ہوں، اس کی علامتوں پر غور کریں گے تو آپ کو اس کہانی کے حوالے سے "پاکستان قومی اتحاد" کا صحیح چہرہ دکھائی دینے لگے گا۔ اور وہ نقاب جو مقدس چہروں پہ پڑا ہوا ہے اُترتا چلا جائے گا۔

اس کہانی کا نام "پرفیکٹ جنٹلمین" (PERFECT GENTLEMAN) ہے۔ جسے میں نے عنوان میں جمع کے صیغے میں استعمال کرتے ہوئے پرفیکٹ "GENTLEMEN" بنا دیا ہے۔

کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے!

شہر کی بڑی منڈی میں ہر ہفتے ایک چھیلا بانکا آیا کرتا تھا۔ جس کے جمال اور حُسن سے ہر شخص متاثر تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت بے مثل تھی۔ ایک ایک عضو ترشا ہوا، سانچے میں ڈھلا ہوا۔ نین نقش ایسے کہ جو دیکھے دوسری بار دیکھنے کی خواہش کرے۔ وہ ہر ہفتے بڑی منڈی میں آتا اور پھر کچھ سودا سلف خرید کر یا بیچ کر چلتا بنتا۔ اس کی چال ڈھال، لباس اور ہر حرکت میں حسن ڈھل کر رہ گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے۔

قصبے کے چوہدری کی بیٹی نے اسے ایک نظر دیکھا اور اسے دل دے بیٹھی۔ وہ ہر ہفتے اس کو دیکھنے، اس کے جمال سے آنکھیں سیراب کرنے کے لیے منڈی میں پہنچ جاتی۔ رعبِ حسن کی وجہ سے وہ اس سے بات نہ کر پاتی تھی۔ بس جدھر وہ جاتا۔ اُدھر ہو لیتی۔ اس سے کچھ فاصلے پہ رہتی، لیکن نظریں اسی پہ جمی رہتی تھیں۔ کئی ہفتے وہ اسے دیکھتی رہی۔ دل کی بیقراری بڑھتی رہی۔ اس کے بارے میں محتاط انداز میں اس نے کچھ جاننے اور معلومات حاصل کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن کسی کو خود اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس بیچاری کو کیا بتاتے۔

وہ اس چھیلے بانکے اور مردِ حسین کو اپنے دل میں بسا چکی تھی!

ایک دن جب وہ جوان رعنا ۔ وہ پرفیکٹ جنٹلمین ۔ منڈی میں پہنچا تو وہ حسینہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس روز وہ کچھ ارادہ کر کے آئی تھی اور دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اس جوانِ رعنا کا اتہ پتہ معلوم کر کے ہی رہے گی۔ دن دوپہر میں ڈھلا اور دوپہر سہ پہر یں اور پھر وہ جوانِ رعنا منڈی سے روانہ ہوا۔!

وہ اس کی تاک میں تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے فاصلہ دے کر چلنے لگی۔ وہ جوان رعنا پنی دھن میں مگن چلتا رہا۔ پھر سڑک سے اُتر کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ وہ جو اس کی دیوانی تھی، ہ بھی جنگل میں اُتر گئی۔ وہ ابھی تک تازہ دم اور پُرجوش تھی اور وہ نہ ہراساں تھی نہ پریشان پھر جب وہ جوانِ رعنا گھنے جنگل میں پہنچ گیا۔ جہاں تاریکی اور روشنی باہم گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ ر اس حسینہ نے دیکھا کہ وہ جوانِ رعنا ایک جگہ رُکا ہے۔

درخت کی اوٹ میں کوئی کھڑا تھا جس کو اس نے اپنے جسم سے اپنا ایک بازو اتار کر ے دیا اور ساتھ ہی بازو کا کرایہ بھی۔ حسینہ کے دل میں حیرت کا طوفان برپا ہوا۔ یا الٰہی یہ یا ماجرا ہے۔ یہ جوان رعنا ۔ کیا مانگے کے اعضا لیے پھرتا ہے۔ پھر وہ اسی استعجاب اور تجسس ے ہاتھوں آگے بڑھتی گئی اور وہ جوانِ رعنا رُکا اور پھر اس نے کسی کو اتار کر اپنا دوسرا ز و بھی دیدیا اور بازو کا کرایہ بھی۔

اور پھر اب یوں ہوا کہ وہ چند قدم کے بعد چلتا اور پھر رُک جاتا اور اپنے جسم سے یک ایک عضو اتار کر دیتا چلا جاتا تھا۔

وہ جو پرفیکٹ تھا۔ مکمل تھا حسن وجاہت کا نمونہ تھا۔ اب وہ ڈراؤنی مخلوق نظر آ ہا تھا۔ اس کا اپنا تو کچھ بھی نہ تھا۔ ہر چیز مانگے کی تھی۔ ادھار اور مستعار لی تھی اور وہ اس کا یہ ادا کرتا، عضو اتارتا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔

اس کے ہاتھ اُترے، بازو اُترے، کندھے اُترے، پاؤں اُترے، ٹخنے اُترے، ٹنے اُترے۔ وہ عجیب طرح سے گھسٹ کر چل رہا تھا۔ پیٹھ کے سہارے اور جب ہ چند اور مقامات پر اُترا اور پھر آگے بڑھا تو اب وہ صرف ایک ننگی بچی کھوپڑی تھا۔

بس!

اور وہ کھوپڑی ایک عجیب، بھیانک اور کراہت انگیز انداز میں زمین پہ اُچھل اُچھل کر آگے بڑھ رہی تھی، اس کھوپڑی ۔ اس چہرے کے اوپر سے جلد اُتر چکی تھی۔ اور اس کے منہ کی جگہ ایک سوراخ تھا اور اس میں نہ زبان تھی نہ دانت تھے اور آنکھوں کے گڑھوں میں بھی کچھ نہ تھا۔ خالی گڑھے تھے اور جہاں کان ہوتے ہیں وہاں بھی سوراخ تھے۔

وہ جس کے حسن، جس کی وجاہت پر وہ مرتی تھی جس کے لیے اس نے کئی خواب دیکھے اور گھر والوں سے چوری عزت اور ناموس کو خطرے میں ڈال کر وہ باہر نکل آئی تھی۔

وہ ایک بھیانک کھوپڑی تھی۔

وہ چیخنے لگی، اس کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔ وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

اب وہ گھر جانا چاہتی تھی، اس جنگل سے نکلنا چاہتی تھی، لیکن راستہ گم ہو گیا تھا۔ اور وہ عفریت، وہ کھوپڑی اس کا تعاقب کر رہی تھی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ وہ تھک گئی۔ وہ خوف سے نڈھال ہو رہی تھی۔ کھوپڑی اس کا راستہ ہی نہ چھوڑتی تھی، گھناؤنی اور خوفناک چال سے چلتی وہ اس کے سامنے آ جاتی اسے ڈراتی تھی۔ پھر وہ جس پہ اس جوان رعنا کی اصلیت کھل گئی تھی۔ جسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جسم جسے وہ سانچے میں ڈھلا ہوا سمجھتی تھی۔ اصل میں سب مانگے کے اعضا سے مکمل ہوا تھا۔ وہ حسینہ ۔ خوف سے، تھکن سے، نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔

اس کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا
وہ بھیانک کھوپڑی سے ڈر گئی تھی

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک غار میں پایا۔

اور اس کے سامنے وہ کھوپڑی بیٹھی تھی، اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل رہی تھی۔ وہ قوتِ گویائی سے جیسے محروم ہو گئی تھی۔

پھر وہ کھوپڑی اس کی طرف بڑھی اور اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور پھر اسے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکی اور اس نے دیکھا کہ اس کو بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رسیوں سے باندھ دیا گیا ہے۔ اس کی قوتِ گویائی چھین لی گئی ہے اور بندھے ہوئے پاؤں میں ایک تنگ اور مضبوط زنجیر میں گھنٹی باندھ دی گئی ہے اور جب وہ حرکت کرتی ہے تو گھنٹی بجنے لگتی ہے۔

شام سے جب رات ہوئی تو قصبے کے چوہدری کو بیٹی کی فکر لاحق ہوئی۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ اُس کی بیٹی بغیر اطلاع دیئے اتنی دیر تک کبھی گھر سے باہر رہی ہو۔ وقت بھی نازک تھا۔ بیٹی بھی لاکھوں میں ایک اور حسین تھی۔ اس کی ڈھنڈیا پڑی۔ رات ساری بیت گئی اور دوسرا دن بھی شروع ہو گیا۔ مگر اس کی بیٹی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ باپ کی جان پر بن گئی۔ جب چاروں طرف تلاش کے باوجود ناکامی ہوئی اور کسی طرح بھی کوئی کھوج یا سراغ لڑکی کا نہ ملا تو اُسے آخری امید اور سہارے کا خیال آیا۔

وہ ایک بزرگِ دانا تھا کہ جس کو غیر معمولی بصیرت اور دانائی حاصل تھی وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ چوہدری اس بزرگ کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا بیان کی اور اس بزرگ نے کہا:۔

"میری تو ساری عمر ان چیزوں کے خلاف جدوجہد کرتے گزر گئی ہے۔ جو اپنا آپ چھپائے پھرتی ہیں۔ جو اپنی اصلیت پر پردے ڈالے پھرتی ہیں اور جن کا اپنا

اصغر خان نے فوج سے اپیل کی کہ حکومت سے تعاون نہ کیا جائے

کچھ بھی نہیں ہوتا ......

اس کے بعد اس بزرگ نے اپنی غیر معمولی بصیرت اور صلاحیتوں سے کام لیا اور اس بدنصیب باپ کو بتایا کہ اُس کی بیٹی تو کھوپڑیوں بھری بیٹھی ہے اور وہ جسے جوانِ رعنا سمجھ کر دل دے بیٹھی تھی۔ دراصل اس کا تو اپنا کچھ نہ تھا وہ تو مانگے تانگے کی چیزوں سے مکمل اور خوبصورت بنا تھا۔ اب وہ لڑکی اس کی قید میں ہے اور اُس نے اُسے باندھ رکھا ہے اور اس کے پاؤں کی زنجیر میں گھنٹی باندھ دی ہے اور وہ بے چاری ذرا ہلنے کی کوشش کرتی ہے تو گھنٹی بج اٹھتی ہے اور جب تک وہ گھنٹی اس کے پاؤں میں بندھی ہے۔ کھوپڑی۔ کو کچھ فکر نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ گھنٹی کی طاقت سے واقف ہے کہ گھنٹی بجتی ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ لڑکی بھاگنا چاہتی ہے اور تمہاری لڑکی بے چاری کی قوتِ گویائی بھی سلب کر لی گئی ہے۔

اپنی بیٹی کی اس دکھ بھری حالت کا ماجرا سن کر چوہدری تڑپ اُٹھا اور اُس نے اس مردِ دانا اور صاحبِ بصیرت سے کہا کہ وہ اس کا کوئی توڑ کرے اور وہ مردِ دانا بولا

”تم اسے اپنا ہی مسئلہ نہ سمجھو' یہ تو سب کا مسئلہ ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو تاکہ میں کچھ ایسا قدم اُٹھا سکوں کہ تمہاری بیٹی آزاد ہو جائے۔ اس کے پاؤں میں بندھی گھنٹی اُتر جائے اور اس کی قوتِ گویائی بھی واپس آجائے“

بیٹی کا باپ بے چین تھا وہ تو پلک جھپکنے سے پہلے ہی اپنی بیٹی کو آزادانہ باتیں کرتے ہوئے سنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اس بزرگ نے کہا :۔

”وہ کھوپڑی جو اپنے آپ کو جوانِ رعنا بنانے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ معمولی طاقت نہیں رکھتی پھر اُسے گھنٹی اور زنجیر کی قوت کا سہارا بھی ہے۔ اس کے مقابلے کیلئے تیز ہوا کی ضرورت ہے۔ میں اگر تیز ہوا بن جاؤں تو تمہاری بیٹی کو وہاں سے اڑا کر لا سکتا ہوں .....“

اور پھر وہ مردِ بزرگ اس بیٹی اس لڑکی کو آزاد کرنے کے لیے اپنے وجود سے محروم ہو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوا میں تحلیل کر لیا۔ وہ ہوا میں گھل مل ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس طرح اس لڑکی کو نجات دلا سکتا تھا۔ جب تک وہ اپنے وجود سے محروم ہو کر ہوا نہ بنے تب تک اس لڑکی کا مسئلہ۔ جو سب کا مسئلہ تھا۔ حل نہ ہو سکتا تھا۔

اور وہ لڑکی اسی ہوا میں اڑ کر وہاں سے چلی آئی۔ اب اس کی قوتِ گویائی کچھ بحال ہو رہی ہے لیکن ابھی تک اس کے پاؤں میں زنجیر بھی ہے اور زنجیر کے ساتھ گھنٹی بھی بندھی ہے... اور وہ مردِ دانا۔ اپنا آپ قربان کر چکا ہے.....

اور یہاں نئے افریقہ کے ایک نئے افسانہ نگار کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کہانی کی علامتوں پر ایک نظر ڈالئے۔ جوانِ رعنا۔ مانگے ہوئے اعضا سے مکمل ہونے والا انسان۔ ایک ایک چیز ادھار اور کرائے پر لینے والا۔ اس پر مر مٹنے والی لڑکی۔ جوانِ رعنا کی حقیقت۔ کھوپڑی۔ صاحبِ بصیرت دانا' اس کا ہوا میں تحلیل ہونا۔ ہوا' قوتِ گویائی سے محرومی' زنجیر اور گھنٹی ....

مجھے اس کہانی کو پڑھ کر' اسے یاد کرتے یوں لگا جیسے میں اپنے ملک کی سیاسی صورتِ حال پر ایک زبردست افسانہ پڑھ رہا ہوں۔ اس میں ہمارے اس عہد کی ساری سچی صورتِ حال ملتی ہے۔

جوانِ رعنا۔ قومی اتحاد ہے۔ حسین لڑکی۔ عوامی آزادی کی روح ہے۔ اس ملک کے انسانوں کا خواب ہے اور کھوپڑی اس جوانِ رعنا کی حقیقت کی علامت ہے۔ صاحبِ بصیرت' جو ہوا میں تحلیل ہوا۔ بھٹو ہے اور قوتِ گویائی سے محرومی..... وہ گھٹن اور حبس ہے جو مارشل لا اور اس کے احکام (زنجیر اور گھنٹی) سے پیدا ہوا ہے اور پھر وہ لڑکی۔ کچھ کچھ بولنے لگی ہے..... یہ اظہار کی وہ خود مختار قوت ہے جس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔

آئیے ان علامتوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیں۔ پاکستان قومی اتحاد نے تحریک چلائی۔ اس تحریک میں بڑی کشش تھی۔ لیکن تحریک چلانے والے خود اس تحریک سے مخلص نہیں تھے۔ ان کے سامنے تحریک ایک ذریعہ تھی۔ ایک سیڑھی تھی جس کے ذریعے وہ اُوپر اٹھنا چاہتے تھے بھٹو کو ختم کرنا چاہتے تھے اور اقتدار پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ وہ خود اقتدار پر قابض ہوئے بغیر اسلام کے نفاذ کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں۔ وہی اسلام پسند تھا۔ جسے وہ خود نافذ کر سکیں۔ اقتدار کے ذریعے۔ اس ملک کے عوام جنہیں بھٹو نے اجتماعی شعور سے مالا مال کیا تھا۔ وہ بھٹو کے خلاف نکلے۔ لیکن سارے عوام نہیں، وہ لوگ جو قومی اتحاد کی تحریک سے متاثر تھے۔ جو اسلام کے خوش نما اور پُرکشش نعرے سے متاثر ہوئے تھے۔ جو حقیقت سے آشنا نہ تھے۔ جنہیں ورغلایا گیا تھا۔ اسلام کو بھٹو نے اپنی پارٹی کے منشور کی پہلی شق رکھا تھا۔ اس ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا۔ بھٹو کے عہد میں وہ آئین بنا۔ جس میں پہلی بار صحیح معنوں میں اسلام کی سربلندی اور حاکمیت کی ضمانت دی گئی۔ لیکن مسجدوں اور مذہبی مقامات سے آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ اسلام کے نفاذ کے نام پر توڑ پھوڑ کا بازار گرم ہوا۔ اسلام کو سیاسی ہتھیار بنایا گیا۔ قومی اتحاد کے رہنما سرکاری مہمان بن کر مُرغ اڑاتے اور آئس کریم سے دل بہلاتے رہے اور عوام تحریک چلا کر زخمی ہوتے اور مرتے رہے اور اس ملک میں وہی کچھ ہوتا رہا جو یہاں کی روایت تھی۔ جلسے' جلوس' حکومت کی مزاحمت' تصادم ..... یہ کوئی نئی ریت نہ تھی اسے ہم نے کبھی مستحسن نہیں سمجھا۔ لیکن ایسا ہوا اور اس میں کئی بے گناہ مارے گئے اور کئی بے گناہ زخمی اور اپاہج ہوئے۔ ایک بار پھر پرانا کھیل کھیلا گیا تھا۔ آزمودہ نسخہ۔ آزمایا جا رہا تھا۔ بھٹو دشمنی کو کفر دشمنی کا نام دیا گیا۔ اسلام اور کفر کا پھر میدانِ کارزار گرم کیا گیا۔

صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے انتظامیہ حرکت میں آئی۔ فوج نے بھی شہروں کا رُخ کیا۔ کرفیو لگے۔ فوج اور لوگوں میں مزاحمت ہوئی۔ اس کے باوجود فوج کے سربراہ بھٹو حکومت کی وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔ جبکہ جنرل ضیاالحق کے اپنے بیانات اور انٹرویوز سے پتہ چلتا ہے کہ اندر کھاتے وہ اپنے حساب سے ملک و ملت کے مفاد کے لیے 'اپریشن فیئر پلے' کی تیاری کرتے رہے تھے یعنی ایک منتخب اور آئینی حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں' جس کے ساتھ وہ وفاداری کا اظہار بھی کرتے چلے جا رہے تھے۔

مذاکرات شروع ہوئے۔ بھٹو حکومت نے مذاکرات کی دعوت دی۔ پھر لمبی نشستیں جمیں۔ پوری پوری رات معاملات نمٹانے میں صرف کر دی گئی اور پھر مذاکرات کی کامیابی کا اعلان ہوا۔ بس دستخط کرنے باقی رہ گئے تھے، کہ قومی اتحاد نے ایک فیصلہ کیا اور وہ مذاکرات کے نتائج اور باہمی فیصلوں سے منحرف ہو گئے۔

کس کی شہہ پر؟

یہ سوال ابھی جواب کا طلب گار ہے۔ بھٹو کہتے ہیں کہ قومی اتحاد اور فوج میں گٹھ جو ہو چکا تھا۔ کچھ حلقے کہتے ہیں کہ مذاکرات کے نتیجے میں طے ہونے والے فارمولے پر اس لئے دستخط نہ ہو سکے کہ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان اڑ گئے تھے۔ انہوں نے پورے قومی اتحاد کو سبوتا کرنے کی دھمکی دیدی تھی۔

اصغر خان جنہوں نے اس زمانے میں اپنی تقریروں میں یہ کہا کہ فوج پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ ہے۔ جنہوں نے آئین اور ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستانی فوج کے جرنیلو کو بھٹو اور بھٹو حکومت کے خلاف خطوط لکھے اور انہیں اُکسایا کہ وہ اس حکومت کا ساتھ نہ دیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے اور دوسرے راہنماؤں نے بھی فوج کو صورتِ حال میں ملوث کرنے کی کوشش کی اور پھر جو نتیجہ سامنے آیا ہے اس سے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر فوج کے سربراہ۔ اس تحریک کے زمانے میں۔ تحریک کے ساتھ ملوث نہ تھے تو وہ اگ

تحریک سے متاثر ہوئے تھے اور ان کے اسی تاثر اور صورتِ حالات کے تجزیے نے انہیں مجبور کیا کہ وہ حکومت پر قبضہ کر لیں۔ گویا فوج کے سربراہ اور دوسرے جرنیل۔ خود جنرل ضیاالحق کے مختلف بیانوں کی روشنی میں صورتِ حال میں دلچسپی لے رہے تھے اور فکرمند تھے۔

اس وقت جبکہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے اور مذاکرات کے نتیجے میں طے ہونے والے فارمولے پر دستخط ہونا باقی تھے۔ کسی ایک وجہ یا بہت سی وجوہات کی بنا پر بساط ہی الٹ دی گئی۔

آئین معطل ہوا۔ اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا!

ادھر مارشل لا نافذ ہوا۔ اُدھر پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مارشل لا کا خیرمقدم کیا جانے لگا۔

بعض اوقات اپنے سیاسی رہنماؤں کی بے اصولی اور اپنے عوام کی سادہ لوحی پر المناک حیرت ہوتی ہے کہ یہ قوم جس نے جمہوریت اور رائے عامہ کے بل بوتے اور طاقت پر ایک ملک حاصل کیا۔ جس کا بانی ہمیشہ جمہوریت اور آزادئ اظہار کے لیے جنگ لڑتا رہا اور جس نے جمہوریت قانون اور آزادئ اظہار کے ہتھیاروں سے جنگ جیتی، کس طرح مارشل لا کا خوشی سے استقبال کرتی ہے۔ مارشل لا حکومتوں کے بڑے تلخ تجربوں کے باوجود پھر کس طرح مارشل لا کو ہاتھ اٹھا کر سلوٹ کرتی ہے۔

مارشل لا حکومت نے نوّے دن کے اندر اندر انتخابات کرا کے بیرکوں میں واپس جانے کا وعدہ اور اعلان کیا۔

یہ وعدہ آج تک پورا نہ ہوا۔ بھٹو کے خلاف دشنام وطعن کا بازار گرم ہوا اور پاکستان قومی اتحاد نے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ موجودہ مارشل لا کی حکومت دراصل ان کی حکومت ہے۔ ان کی فتح اور کامرانی کی نشانی ہے۔

ادھر پاکستان قومی اتحاد میں پھوٹ پڑ گئی۔ نو ستارے بکھرنے لگے اور مانگے تانگے کے عصا واپس لیے جانے لگے

پرفیکٹ جنٹلمین — کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ بھٹو دشمنی نے انہیں اکٹھا بنا تھا اور بھٹو پر قتل کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ اقتدار پر قابض ہونے کے وہ خواب دیکھ رہے تھے جو پورا نہ ہوا تھا۔ کیونکہ فوج نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ وہ جو جمہوریت اور اسلام کے نام پر لوگوں کو سڑکوں پر لائے تھے۔ اب وہ خود بوکھلا رہے تھے اور ان میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ "منڈی" سے سودا خریدا جا چکا تھا۔ اب واپسی کا سفر تھا اور پھر تحریکِ استقلال نے اپنے دست و بازو کو اتارا۔ پھر جمعیت العلماء کے مولانا شاہ احمد نورانی نے اس کے پاؤں اور ٹانگیں توڑ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد این۔ ڈی۔ پی نے بھی اوپر کا سارا دھڑ غائب کر کے رکھ دیا۔ جو — جس کا تھا۔ وہ اسے لے کر چلتا بنا۔ لیکن — وہ جو "پرفیکٹ جنٹلمین" ہونے کے مدعی تھے۔ وہ اب بھی یہ کہہ رہے تھے دہیں، کہ وہ تو مکمل ہیں ان کا ہر عضو سلامت ہے اور ذہن بھی!

لیکن ان کے ذہن کی یکسوئی اور سیاسی اتحاد و استحکام کی کیا کیا مثالیں دی جائیں + بھان متی کا کنبہ — کب تک "جڑا" رہ سکتا تھا۔ اعلان ہوا کہ ہم حکومت میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مارشل لا حکومت میں شرکت — ہمارے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے۔ ابھی ایسے بیانات کی سیاہی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ حکومت میں شامل بھی ہو گئے۔ مقصد — حکومت میں شرکت نہ تھا۔ بلکہ مارشل لا حکومت سے تعاون تھا۔ آزادی، قانون، جمہوریت کی سیاست پر ایمان رکھنے والے مارشل لا حکومت سے تعاون پر مجبور ہو گئے اور پھر حکومت میں آنے کے بعد ان سے جو جو بوالعجبیاں ہوئیں ان کی داستانیں کہاں تک بتائی جائیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی اس کا "قرطاسِ اسود" شائع کر رہے ہیں۔

پاکستان قومی اتحاد میں پھوٹ پڑی۔ مسلم لیگ کے ٹکڑے ہوئے۔ این۔ ڈی۔ پی نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ "اسلام کا تو مسئلہ اس ملک میں نہ کبھی پہلے تھا نہ اب ہے کہ اسلام ملک کا سرکاری مذہب ہے۔ ہم تو سیکولر حکومت کے قائل ہیں اور ہم اسلام کے نفاذ کے لیے پاکستان قومی اتحاد میں شامل نہ ہوئے تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے فرمایا "سوشلسٹوں اور لادینوں کو پاکستان قومی اتحاد کے پلیٹ فارم پر فریب دے کر ساتھ ملایا گیا تھا تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے سکیں"۔

ناطقہ سربگریباں۔ ۔ ۔ والا مضمون ہے۔ اب ایک دوسرے پر الزام تراشی کا بازار گرم ہے۔ ایک دوسرے کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جا رہا ہے۔ "پرفیکٹ جنٹلمین" اپنے پرچے اڑا رہے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پاکستان قومی اتحاد کے رہنما — سینہ ٹھونک کر اعلان کرتے تھے کہ روزمرہ کی ضروریات کی قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی سطح پر لے آئیں گے۔

بھٹو کہتے تھے کہ ایسا ممکن نہیں رہا۔ عالمی اور ملکی حالات ایسے ہیں کہ ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ تب بھٹو کی کھلی اڑائی جاتی تھی اور جب پاکستان قومی اتحاد کے وزراء — مارشل لاء حکومت کے تعاون سے اس طرح "دستبردار" یا "سبکدوش" ہوئے کہ حکومت سے نکل آئے تو آٹے کی قیمت میں — اتنا اضافہ ہو چکا تھا جتنا اس ملک میں کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی کارکردگی، سیاسی بصیرت اور عملی خدمت کی اس سے بہتر مثال نہیں دی جا سکتی۔

اُدھر عوام الناس ان رقموں کا حساب مانگ رہے ہیں جو انہوں نے تحریک کے زمانے میں ان رہنماؤں کی جھولیوں میں نفاذِ اسلام کے لیے ڈالی تھیں۔ اصغر خان کے بارے میں قومی اتحاد کے رہنما الزام لگا چکے ہیں کہ انہیں جو خطیر رقم دی گئی تھی وہ اسے لوٹانے یا اس کا حساب دینے سے منحرف ہیں۔ ادھر بزرگ منصفوں میں۔ سے بھی ایک حساب دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔

اب سارے اعضا اتر چکے ہیں بس کھوپڑی باقی ہے اور کھوپڑی کا جادو چل رہا ہے۔ اور — عوام — آزادی کی روح کے گلے میں مارشل لا کی گھنٹی باندھ دی گئی ہے۔ اور پاؤں میں زنجیریں ہیں۔ آزادی قید ہے اور مردِ دانا — جس نے ہوا بن کر — اس آزادی کی علامت کو کھوپڑی کے غار سے نکالا تھا۔ اپنا وجود کھو بیٹھا ہے۔ اس کا ظاہری وجود نظروں سے غائب ہو چکا ہے لیکن — وہ ہوا میں تبدیل ہو چکا ہے — ہوا — جو استعارہ ہے جو انسانی زندگی کے تسلسل اور بقا کی علامت ہے۔

افریقی کہانی کی حسینہ پرفیکٹ جنٹلمین — جوانِ رعنا کے اپنے متناسب اور خوبصورت وجیہہ اور پرکشش جسم اور چہرے کی وجہ سے ورغلائی گئی تھی۔ اور موت اور تاریکی کے جنگل میں پہنچ گئی تھی، نوستاروں نے بھی عوام کو اسلام کے نام پر للکارا۔ اور اب جب کہ ان کے چہروں سے نقاب اتر چکا ہے۔ تو لوگ جان گئے ہیں کہ ان کی اصلیت کیا تھی۔

اور کسی نہ کسی کو ہوا میں تحلیل ہونا اور ہوا بننا پڑتا ہے۔

بھٹو کی موت کی ایک معنویت یہ بھی ہے کہ وہ ہوا بن گیا ہے۔ اس نے آزادی کی روح — جو غار میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسے وہاں سے آزاد کرا دیا ہے اپنے ظاہری وجود کی قربانی دے کر —

لیکن — کھوپڑی اب بھی موجود ہے۔!

اور آزادی کی روح — کے پاؤں میں زنجیر بھی ہے اور گھنٹی بھی۔

وہ آزاد ہونے کے لیے جب بھی پاؤں کو حرکت دیتی ہے گھنٹی بجتی ہے اور۔ ۔ ۔ ۔

لیکن تابکے — کب تک۔ ۔ ۔

ایک نہ ایک دن زنجیر نے ٹوٹنا ہے۔ مارشل لاء نے اٹھنا ہے۔

اور عوام کو ان کے حقوق ملنے ہیں۔ انہیں اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملنا ہے۔

اور اس ڈرامے کا آخری پردہ گرنے والا ہے۔ اب کوئی بہروپ نہ بھرا جائے گا جس سے عوام کی روحِ آزادی کو بہکایا اور سلب کیا جا سکے گا۔

آخری پردہ گرنے والا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد کوئی ماسک چڑھائے سٹیج پر لوگوں کو بے وقوف بنانے نہ آ سکے گا۔ کوئی گھنٹی پھر نہ بجے گی۔ کیونکہ آخری گھنٹی بجنے والی ہے۔

اور جو ہوا بن گیا ہے وہ زندہ رہے گا۔

کیونکہ ہوا — کا کام چلتے رہنا ہے۔ محسوس اور غیر محسوس انداز میں، زندگی دیتے رہنا ہے۔!

* * *

"جلا کے مشعل جاں ....."

وحید قریشی جھلسا پڑا ہے۔

یعقوب پرویز نے اپنے آپ کو آگ لگائی اور مر چکا ہے۔

مہر عبدالرشید عاجز زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

کیا میں پتھر ہوں۔ بے حس ہوں۔

نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ!

میں خاموش نہیں رہ سکتا ـــــ اپنی کیفیت کو لفظوں کے ذریعے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک معمولی سا انسان ہوں .....

بزدل ہوں ......

اس لیے جب میں اپنے تاثرات کو الفاظ کی صورت دینے پر آمادہ ہوتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس بدذوقی کا مظاہرہ بھی کرنا پڑے گا کہ میں اپنے تاثرات اپنے دل کی بات کہنے سے پہلے تمہید باندھوں ......

ہاں۔ بات کہنے سے پہلے۔ آج کے دور میں تمہید باندھنا ضروری ہو گیا ہے۔

میں نہ دانشور ہوں نہ ادیب، صحافی نہ شاعر ایک معمولی سا قلم کا مزدور ہوں۔ کوئی دعویٰ نہیں۔ بجز اس کے کہ۔ ادب کو پڑھا ہے۔ ادب کے آئینے میں زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور زندگی کے آئینے میں ادب کی سچائیوں کو دریافت کرنے کی سعی کرتا رہتا ہوں۔

میرے نزدیک۔ سارا مسئلہ انسانی ہے اور انسانی مسئلے کو زندگی اور ادب کے حوالے کے بغیر سمجھنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ....

جب انسانی تاریخ پر نظر دوڑاتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ پوری انسانی تاریخ میں اپنے آپ کو اس طرح جلانے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ......

انسانوں کو زندہ جلائے جانے کی تاریخ بہت پرانی ہے .....

کبھی حریت اور آزادی کو۔ جون آف آرک کی طرح زنجیروں میں جکڑ کر نذرِ آتش کر دیا گیا۔ لیکن وہ جگہ جہاں جون آف آرک جلائی گئی تھی۔ آج وہاں پھول کھلے ہیں۔

صدیوں پہلے عورتیں بیوہ ہونے کے بعد ستی ہوتی رہی ہیں۔ چتائیں جلتی رہی ہیں ......

اور پھر یہ چند برس پہلے کی بات تھی، جب ویت نام میں ظلم کے خلاف بدھ کے بھکشوؤں نے اپنے آپ کو آگ لگائی تھی ......

اور اب جو کبھی سوچا نہ تصور کیا تھا وہ میرے ملک میں میرے وطن میں ـــــ ہو رہا ہے۔

انسان اپنے جسموں کو آگ لگا رہے ہیں اور ایک انسان یعقوب پرویز ـــــ اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں مر چکا ہے ......

اس نے کیوں ایسا کیا؟ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوا؟

یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا ایک فرد یا چند افراد کا یہ عمل ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا۔ جان سے پیاری شے کیا ہو سکتی ہے؟ حادثاتی طبعی اور ناگہانی اموات کی بات کچھ اور ہوتی ہے جلسے جلوس میں گولی سے مرنے والا بھی مظلوم اور عظیم ہوتا ہے لیکن وہ موت کیسی موت ہو گی کہ انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے لباس پر تیل چھڑک کے خود تیلی دکھائے اور خود شعلوں کا غسل کرے....

ایسی موت ..... اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنی موت ....

ایک شور مچایا جاتا ہے۔ حرام اور حلال کا ......

صاحبو ..... نیک دل انسانو! ادب میں حرام اور حلال کا تصور وہ نہیں ہے جو محدود ذہنوں میں ہوتا ہے اور انسان کو جب مختار بنا دیا گیا اور اس نے اپنی ہتھیلی پر بنی لکیروں کو پڑھ کر اپنے انجام کو خود اپنے ہاتھوں سے مکمل کیا ہو تو پھر حرام حلال کی بحث نہ لگایئے کہ فیصلہ کرنے والا خدا ہے ...... اور پھر کیا ..... گوئٹے کے ورتھر کی خودکشی حرام تھی؟

آپ چند منٹوں تک آگ کے سامنے اپنی انگلی کو رکھ کر دیکھیے ..... پھر سوچیے کہ جو جسم و جان کو سوختہ کرتے ہیں۔ خودسوزی کا جشن مناتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں یا بہادر ......

مان لیجیے ..... میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جس سوچ، جس نظریئے جس خیال کے تحت انہوں نے اپنے آپ کو آگ لگائی۔ وہ غلط تھا۔ لیکن ـــــ ان کا عزم راسخ تو اس سے کم تر نہیں ہوتا۔ اس سے ان کی شجاعت اور پامردی پر تو حرف نہیں آتا۔ اور غالب نے کہا تھا۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یہ سراسر انسانی مسئلہ ہے ...... اس مسئلے کو انسانی نقطۂ نظر سے ہی دیکھنا پڑے گا۔

یعقوب پرویز ...... ایک بوڑھے باپ کا بیٹا، ایک بوڑھی ماں کا نور۔ ایک بیوی کا شوہر، ایک بچی کا باپ ..... ایک بہن کا بھائی۔ ایک بھائی کا بھائی۔ دوستوں کا دوست، ساتھیوں کا ساتھی۔

وہ ہم سب کی طرح کتنے انسانی رشتوں میں بندھا ہوا تھا۔ کتنی زنجیریں تھیں۔ جن میں وہ ہم سب کی طرح جکڑا ہوا تھا، بوڑھی ماں، بوڑھا باپ، چھوٹی بہن، چھوٹا بھائی، اپنی بیوی، اپنی بچی ...... کیا وہ ان سب کی محبت سے خالی دل رکھتا تھا۔ کیا اسے ان سب کے دکھوں کا اندازہ نہ تھا۔ کیا وہ یہ نہ جانتا تھا کہ وہ مر جائے گا تو ان کو کتنا صدمہ ہو گا۔ ان کی بچی یتیم ہو جائے گی۔ اس کی بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ زمانہ ان کے ساتھ جانے کیا سلوک کیا کرے گا؟ اور پھر اس کی بچی اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس کی محبت، اس کی شفقت سے محروم ہو جائیں گے۔

اس نے سب کچھ سوچا ہو گا ...... اس نے اپنی جان جانے کا بھی احساس کیا ہو گا اور جب اس نے اپنے جسم کو آگ لگائی تھی تو وہ یقیناً یہ سب کچھ سوچ کر کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ

موت حرام اور حلال سے بالاتر ہے

کسی بڑی علامت، کسی بڑے نظریئے، کسی بڑے مقصد کے لیے سب کچھ قربان کر چکا تھا ..... وہ آنے والے دنوں کے سنہرے خواب دیکھتا ہو گا۔ اپنی جان کو یوں شعلوں کی نذر کرنے وال کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ وہ بزدل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کے دل میں جو کچھ تھا اس کا اس نے اظہار کیا تھا۔ اظہار کے لیے وسیلوں کی ضرورت ہوت ہے۔ قلم کی، کاغذ کی، نقطہ کی، رنگ کی، ساز کی۔ اس کے پاس ایسا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ اس کے پاس کچھ کہنے کو تھا اور کہنے کے لیے وسیلہ صرف جان تھی۔

سوچیے ..... دیکھیے ..... کہیں ایسا تو نہیں ہوا تھا کہ جس دور میں وہ زندہ تھا اس دور میں اس سے اظہار کے دوسرے وسیلے چھین لیے گئے ہیں۔ وہ کوڑے کھا چکا تھا۔ سزا بھگت چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اندر ایک الاؤ تھا جو دہک رہا تھا ـــــ رومانیہ ک شاعر ـــــ یوشین بانگا کی ایک نظم ہے "الاؤ"

جلا کے مشعلِ جاں، ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے، ہمارے ساتھ چلے
دیارِ شام نہیں، منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے
ہوا اسیر کوئی، ہم نوا تو دُور تلک
بپاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ بہات چلے
ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی،
وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہاٹ چلے
پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

مجروحؔ سلطانپوری

کیا میں —— اظہار کا ایسا اسلوب کبھی پا سکوں گا
جس میں حدّت سما جائے
ساری اس الاؤ کی
جو میرے دل میں ہے۔
میں لفظ سے محروم ہو کر
سینے میں دہکتا الاؤ لیے
بھٹک رہا ہوں !!

یعقوب پرویز کھوکھر جیسے انسان جو اپنے اندر دہکتے ہوئے الاؤ میں جل رہے ہیں وہ اپنے ہی اندر کے جلتے اور دہکتے ہوئے الاؤ کو جب باہر لاتے ہیں تو ان میں جل جاتے ہیں..... ہم انسانی مسئلہ کو غیر انسانی شکل دے رہے ہیں۔ اس موت کو "ڈرامہ" بتا رہے ہیں..... ڈرامے کے سب کردار نقلی ہوتے ہیں انہیں کتنا ہی کیوں نہ حقیقت سے قریب کیا جائے وہ اس کردار کو کتنا ہی اپنے آپ پر کیوں نہ مسلط کر لیں وہ اصلی کبھی نہیں بن سکتے۔ ارسطو نے جب اداکاری یا "فنون کو" کو نیچر کی نقالی کا نام دیا تھا تو وہ یہی کچھ بتا رہا تھا لیکن موت تو نیچر ہے اور کبھی کبھار کردار اور نیچر اس طرح یکجان ہو جاتے ہیں کہ کردار کی جگہ ہمیں صرف نیچر کھڑی ملتی ہے.....

پھر یعقوب پرویز کھوکھر کی موت ڈرامہ کیسے ہوئی ؟

کہتے ہیں وہ بک گیا، لیکن کن داموں؟ جان کو کون بیچتا ہے..... کب بیچی ہے کسی نے ..... اور پھر اپنی جان کو بیچنا..... اپنے گھر کو آگ لگانا کیا قیمت لے کر ممکن ہو سکتا ہے۔

اناجیل میں ہے کہ یہودا اسقروطی نے تیس سکوں کے عوض یسوع مسیح کی جان کا سودا کیا..... لیکن پھر ہوا کیا، ضمیر نے اسے مار ڈالا۔ اس نے وہ سکے پھینک دیے اور اپنی جان خود لے لی۔ کیا اس کی موت ندامت کی موت نہیں تھی.......

یعقوب پرویز انسان نہ تھا؟ کیا پیسے لے کر اس نے سب کچھ بیچ دیا؟ نہیں..... ایسا انسان

تیس

روپے میں

پیغمبر کی جان

بیچ دی

پھر خودکشی

کر لی۔

کوئی نہیں ہو سکتا، جو بک کر ایسا کام کرے۔ ایسا کام تو..... صرف اور صرف اندر کی روشنی ہو تو کیا جا سکتا ہے......

مجروحؔ سلطان پوری نے کبھی ایک شعر کہا تھا

ے
جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ہر شخص کو بلا لحاظ کہ وہ کس جماعت سے تعلق رکھتا ھے آزادئ اظہار کا حق ملنا چاھیئے۔

یعقوب پرویز جنوں صفات تھا اس نے پہلے اپنے گھر کے سکون، مستقبل کو آگ لگائی اور پھر اپنی جاں کو نذرِ آتش کیا۔ اظہار کا یہی طریقہ اسے نصیب ہوا تھا جمہوریت اور کسی بڑی علامت کے لیے اس نے آگ کے شعلوں میں غسل کیا......

صاحبو! ڈرامہ ہی سہی، لیکن ڈرامہ ختم ہو چکا ہے...... اب ڈرامے سے آگے کی کچھ بات کیجئے۔

لیکن۔ ہم فقرے لگا رہے ہیں۔ بیان دے رہے ہیں۔ ایک انسانی مسئلے کو انسانی مسئلے سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔

شاید ہمارے ضمیر مر چکے ہیں۔ ہم سب نیرو بن چکے ہیں۔ یعقوب پرویز، وحید قریشی، عبدالرشید عاجز، جل رہے ہیں، جل چکے ہیں اور ہم نیرو کی طرح ہنس رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ بیانوں اور موشگافیوں کی بانسریاں بجا رہے ہیں......

ایک انسان مرتے ہوئے خود کو شعلوں کی لپیٹ میں دیتے ہوئے کہہ رہا ہے:

”ایلی ایلی لما سبقتنی“

اے خدا اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا.....

اور ہم ہنس رہے ہیں!

یہ وہ کلمہ ہے جو حضرت عیسٰی نے اپنے مصلوب کئے جانے پر کہا تھا۔ یہ جملہ انسانی مایوسی کی دلالت نہیں کرتا۔ یہ اس ماحول اس تاریکی کو نمایاں کرتا ہے جس میں انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ تو سب کچھ اس تاریکی کے خلاف لڑتے ہوئے ختم کر چکا۔ اے خدا، اب تو اس تاریکی کو کیوں ختم نہیں کرتا۔ اس بے انسانی کا خاتمہ کیوں نہیں کرتا تو نے جو قادرِ مطلق ہے یہ سب کیوں روا رکھا ہے ہم جو نیکوکار ہیں، راہِ حق پر ہیں انہیں اپنی مدد پہنچا..... اور پھر......

کوئی — پر لٹک جاتا ہے.......

کوئی زہر کا پیالہ پی لیتا ہے

کوئی آگ میں کود جاتا ہے

کوئی اپنے آپ کو نذرِ آتش کر لیتا ہے.......

کہ اسی کے بعد خوشنودی حاصل کرنے اور گھٹن کے خاتمے کے لیے صرف اور صرف اپنا آپ ہی پیش کرنا باقی رہ جاتا ہے اور یہی انسانی عظمت اور عزم کی انتہا ہے۔

اور پرویز یعقوب نے یہی کچھ کیا۔ اس سے یہی کچھ ہو سکتا تھا!! اس نے عالمی تاریخ میں ایک نیا باب لکھا ہے ایسا باب جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں ڈھونڈنے سے صرف ایک دو جگہ ملتی ہے......

اور ہم ہنس رہے ہیں۔

ہم اسے ڈرامہ قرار دے رہے ہیں۔

کاروبار کا نام دے رہے ہیں۔

میں ایک معمولی سا قلم کا مزدور ہوں اس عظیم انسانی المیہ سے میں انصاف نہیں کر سکتا۔

اس کے لیے کسی زولا کی ضرورت ہے اس کے لیے وکٹر ہیوگو کی ضرورت ہے جو انسانی جان کی قدر و قیمت کے لیے لڑتا رہا۔ اس کے لیے آرتھر ملر کی ضرورت ہے جس نے ایک بے گناہ لڑکے کو موت کی سزا سے بچانے کے لیے اپنا آپ وقف کر دیا۔

اس کے لیے کسی افلاطون کی ضرورت ہے جو سقراط کی موت کو لازوال بنا دیتا ہے۔

لیکن — شاید میں ایک بات بھول رہا ہوں.....

کہ یعقوب پرویز، عبدالرشید عاجز اور وحید قریشی نے جو کچھ کر دکھایا ہے اس کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں انہوں نے جو کچھ کیا ہے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا خواہ آج ہم ان پر قہقہے لگائیں اور اپنے ضمیر کے ساتھ لپٹ کر سو جائیں۔ یا یہ بحث جاری رکھیں کہ اس نے جو کیا وہ غلط تھا یا صحیح۔ یا اس بحث کو بند کر کے اپنے اپنے ذہنی تعصبات کو پھیلائیں لیکن اس سے اس انسانی مسئلہ کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

انسانی مسئلہ تو یہ ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی جماعت۔ کسی گروپ کسی نظریئے سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ وہ اس حالت تک کیوں پہنچے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اسے اپنی جان ہی دینا پڑے؟

سوال کسی پارٹی ورکر کا نہیں۔ سوال ایک انسان کا ہے اور ادب اور اس کی اخلاقیات میں اسے اسی طرح ہی سوچا اور سمجھا جائے گا کہ انسان انسان ہے۔ خواہ وہ کسی پارٹی یا گروپ سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔ اسے اس حال تک نہ پہنچایا جائے کہ وہ اپنی جان نذرِ آتش کر دے....

اور یہی سوال ہے۔ یہی انسانی مسئلہ ہے جسے اس طرح حل کرنا چاہیئے کہ اظہار کے وسیلوں پر اتنی پابندی نہ ہو کہ انسان زندہ جل مرے اور ہمیں اس مسئلے کو انسانی سطح پر سوچنا چاہیئے۔ ورنہ جو مشعلِ جاں جل اٹھی ہے وہ تو جلتی رہے گی۔ لیکن ہم انسانوں کی بے حسی کو بھی نمایاں کرتی چلی جائے گی۔!

* * *

یہ مضمون ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کے روزنامہ ”مساوات“ لاھور میں شائع ھوا تھا۔ ان دنوں اخبار سنسر کی زد میں نہ آیا تھا اور خود سوزی کرنے والے مر رھے تھے۔ آزادئ اظہار و تحریر کے حق کے لیے — یہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا گیا ھے —

(س — ط)

فیورٹ ڈش

”بھٹو کے زمانے میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔“

”جو ظلم و ستم بھٹو کے عہد میں روا رکھا گیا، اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی“

”بھٹو قاتل، بے رحم، آمر، فاشسٹ، سفاک اور درندہ تھا۔“

”اس کے دست تغلّم سے کوئی محفوظ نہ رہا۔ نہ اپنے نہ بیگانے۔ اُسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ تو صرف اور صرف اپنے اقتدار کو مستحکم اور برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ بھٹو نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔

”میں کمزور سہی — لیکن میری یہ کرسی کمزور نہیں ہے“

”اور جب اس نے یہ جملہ کہا تھا تو اُس نے بڑے زور سے اس کرسی پر ہاتھ مارا تھا۔

”بھٹو کو اس کا ظلم اور اس کا تکبّر لے بیٹھا....

بھٹو کے بارے میں ملک گیر پیمانے پر — پروپیگنڈے کی مہم چلائی گئی۔

پریس کو اس کی گرفتاری کے بعد وہ موقع مل گیا تھا۔ جس کا انہیں مدّتوں سے انتظار تھا۔ جس دن کے آنے کی وہ دعائیں کرتے تھے۔ وہ دن اُن کی زندگی میں آ گیا تھا۔

جب جولائی ۱۹۷۷ء میں بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا تو اس کے بعد پریس میں ایک طوفان بدتمیزی، برپا ہو گیا۔ جسے دیکھو وہ بھٹو پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔ جسے دیکھو وہ بھٹو پر کوئی ”کہانی گھڑ رہا ہے۔ بھٹو کے بارے میں جو جس کے جی میں آیا۔ اُس نے لکھ دیا۔ اور چھاپنے والوں نے چھاپ کر دکھا دیا۔ اور پھر پڑھنے والوں نے اُسے خریدا بھی اور پڑھا بھی۔

وہ اخبار — جن کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ جو ایک مدت سے ”خواب خرگوش“ کے مزے اُٹھا رہے تھے۔ وہ انگڑائی لے کر بیدار ہوئے اور بھٹو پر سرخیاں باندھنے لگے۔

جب قتل کا مقدمہ شروع ہوا تو پھر اخباروں، اور ہفت روزوں کو اور بھی شہ ملی۔ اور بازارِ رسوائی گرم ہو گیا۔ بھٹو کی ذات — اس کے ”سیاہ کارنامے“ — نمایاں اور اجاگر کئے جانے لگے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے سب موضوع ختم ہو گئے۔ جیسے کہنے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ صحافت کے بازار سے سب سودا اُٹھا دیا گیا ہے اور صرف بھٹو کو ہی بیچنے کا قصد کر لیا گیا ہے۔ بھٹو کے ماضی، اس کے آبا و اجداد، اس کے خاندان، اس کے خاندان، اس کی بیوی، اس کی بیٹی، اس کے بیٹے اس کے دوست، اس کے قریبی — کوئی بھی تو نہیں بچا۔ جس کے بارے میں کچھ لکھا اور کہا نہ گیا ہو۔

”کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست“

والی بات ہو گئی تھی۔ صحافتی سطح پر جیسے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ — بھٹو کے لئے ہی لکھیں گے۔ اور بھٹو کو ہی بیچیں گے۔

اور یوں بھٹو — کو ”فیورٹ ڈش“ بنا دیا گیا ایسی فیورٹ ڈش — جو من بھاتا کھاجا تو تھی ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا۔ کہ وہ بکتی بھی خوب تھی۔ خود کھانے میں بھی مزہ آتا تھا اور بیچنے میں بھی اور اس سودے میں نفع ہی نفع تھا۔ گھاٹے کا کوئی امکان نہ تھا۔

یہ کھیل — جاری رہا۔ جب بھٹو جیل کی کوٹھڑی میں — تھا۔ تب بھی جاری رہا۔ جب اس کے خلاف عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو بھی یہ کھیل رُکا نہیں۔ جب اُسے ہائی کورٹ سے موت کی سزا سنائی گئی تو اس کھیل میں اور جان پڑ گئی۔ جب اُس کا معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا تو پھر اس کھیل میں گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ جب سپریم کورٹ سے بھی سزائے موت کی توثیق ہو گئی تو اس وقت بھی کھیل گرم رہا۔ اور نظر ثانی کی درخواست کے رد ہونے اور پھر — اُسے پھانسی دیئے جانے کے بعد بھی — یہ کھیل جاری ہے۔ اور جانے کب تک جاری رہے گا۔ ”فیورٹ ڈش“، کھائی اور بیچی جا رہی ہے۔

ویسے اس سے بھی انکار نہیں کہ اخبار والوں کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں!۔

اور سب سے بڑی مجبوری تو ”سکوپ“، اور ”بڑی خبر“، کی تلاش ہوتی ہے۔ جو سنسنی پھیلا دے۔ جو اخبار کو گرم پکوڑوں کی طرح بکوا دے۔ اخبار والوں کی مجبوریاں گنواتے ہوئے ایک شخص نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ کہ اگر کوئی گرم گرم واقعہ، سنسنی خیز اغوا، قتل، جرم، یا غیر معمولی چونکا دینے والی سیاسی خبر، نہ چھپے تو اخبار والے سمجھتے ہیں کہ اخبار پھیکا اور بے نمک رہا۔ اور اس پھیکے پن کو دُور کرنے کے لئے، بے نمکی کا ذائقہ بدلنے کے لئے — اپنی طرف سے ہی ایسی خبریں گھڑی جاتی ہیں۔ کہ فلاں قصبے میں تین سروں والا بچھڑا پیدا ہوا۔ اور فلاں گاؤں میں بکری نے جس بچے کو جنم دیا، اس کے پیٹ پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

اور اگر کبھی جنگ چھڑ جائے تو اخبار کے دن پھر جاتے ہیں۔ اور یا پھر بھٹو جیسے انسان پر مقدمہ چلے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ اخبار تو وہ ہیں جو اپنے آپ کو آزاد اور بے لاگ صحافت کا علمبردار بتاتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو ٹرسٹ کے اخبار ہیں۔ ٹرسٹ کے اخبار والوں کا مسئلہ تو سیدھا سادا ہے۔ کہ جو مرضی سرکار کی ہو۔ وہ اس پر چلتے ہیں۔ ان کی اپنی رائے کا اظہار خود ان کے اخباروں میں ممکن نہیں۔ انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ کون جاتا ہے کون آتا ہے۔ مرحوم صدر ایوب خان کے زمانے سے اب جنرل ضیاء کی حکومت تک۔ ان کی راہ متعین ہو چکی ہے اور یہ اخبار ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ اور ان کی مہار اوپر والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ اخبار اس حد تک ”ٹھس“، ہو چکے ہیں کہ جس شخص کی تعریف میں یہ اس کے عہد میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہوں۔ جب وہ اقتدار پر نہ ہو۔ تو پھر ”ریورس گیر“، لگ جاتا ہے۔ اور اس کی بنیادی خوبیاں جن سے اخبار بھرا پڑا ہوتا تھا۔ اُس کی برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

ہفت روزوں کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔ کچھ ہفت روزوں کا مقصد وحید ہی تھا کہ وہ بھٹو کی حکومت پر تنقید کریں۔ بھٹو کے دور میں یہ اپنے تئیں حق کی آواز لگاتے رہے۔ اور بھٹو کے دور میں ان ہفت روزوں پر پابندیاں بھی لگیں اور پھر انہیں جیلوں میں بھی ڈالا گیا۔ اب وہ ہفت روزے جنہیں بھٹو حکومت میں دبایا جاتا تھا، صحافتی اخلاق اور آداب کے اُس کھونٹے سے رسّی تڑا کر بھاگ نکلے ہیں۔ جس کھونٹے پر وہ پہلے بھٹو

کیا بھٹو کو چاہنے والے اس ملک میں ایک دو کروڑ لوگ بھی نہ ہونگے۔ اور کیا وہ اس کی موت پر پرسکون نظر آئیں گے

کے دور حکومت میں بڑا زور دیتے تھے۔ بھٹو کے دور میں جو ہفت روزے اور ایک دو اخبارات تھے —— بھٹو کے ہم نوا تھے۔ اب ان پر "پیغمبری" وقت پڑا ہے۔ ان سے ضمانتیں طلب ہوئیں۔ پھر ان کے ڈیکلریشن منسوخ ہوئے۔ اور یہ جریدے دوسرے جریدوں کے چولے بدل کر سامنے آ رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح بھٹو کے زمانے میں ان کے مخالف جریدے پابندیوں کے بعد چولے بدل بدل کر سامنے آتے تھے۔ بھٹو کے دور میں بھی بعض اخباروں پر سنسر رہا۔ اور اب جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی بعض اخباروں پر سنسر کی قینچی چلتی ہے۔ بھٹو کے دور میں جس طرح بعض جرید سے زیر عتاب رہے۔ اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی بعض جریدے معتوب ہیں۔

"جلا کے مشعل جاں ..." والے باب کے بعد اس صورت حال کا جائزہ لینا چاہیئے تھا۔ کہ آخر بھٹو کے وہ جاں نثار اور وہ پرستار جنہوں نے بھٹو کی زندگی اور اسیری کے ایام میں خودسوزی جیسی مثالیں قائم کیں۔ وہ بھٹو کی سزائے موت کے بعد کیوں خاموش رہے؟

اس کا مختصراً تجزیہ تو یہ ہے کہ بھٹو کو جہاں ایک طرف "فیورٹ ڈش" سمجھ کر بیچا اور کھایا جاتا رہا۔ دوسری طرف اس کے چاہنے والے بھی اسے ایک "مقدس" چیز سمجھنے لگے تھے۔ حالانکہ وہ انسان تھا۔ اور اس پر ایک شخص کو قتل کرنے اور قتل کی سازش کرنے کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اور مروجہ قوانین کے تحت اس کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن بھٹو کے شیدائی اس زعم اس غلط فہمی اور اس تساہل کا شکار رہے کہ بھٹو —— عظیم و برتر ہے۔ اور اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

جس طرح بھٹو کے خلاف پروپیگنڈے اور اسے دنیا کا بدترین انسان ثابت کرنے میں مبالغہ اور غلو سے کام لیا گیا۔ اس طرح بھٹو کے پرستاروں، پیپلز پارٹی کے لاکھوں ورکروں نے بھٹو کو ایک 'دیوتا' کی سی حیثیت دے رکھی تھی۔ اور وہ کہتے تھے کہ بھٹو کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ وہ ایک ایسا شخص ہے۔ جسے چھوا نہیں جا سکتا۔

جب ملک میں بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تو عام لوگوں میں ایک تاثر یہ بھی تھا۔ کہ یہ سب کچھ بھٹو ہی کے ایماء پر ہوا ہے۔ تاکہ پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کو اس طرح دبا دیا جائے۔ اور پھر لوگوں نے بھٹو کی رہائی کے بعد جس طرح اس کا استقبال راولپنڈی سندھ اور لاہور میں کیا۔ اس سے لوگوں کو یہ تقویت پہنچی کہ اب الیکشن ہونے والے ہیں۔ اور بھٹو پھر برسر اقتدار آ جائے گا۔ جب کہ بھٹو کو مقدمہ قتل کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ضمانت ہوئی اور پھر گرفتار کر لیا گیا تو لوگوں کو ایک دھچکا لگا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن جلد ہی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ بھٹو کے شیدائیوں اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو اپنی اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ گرفتاریوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ احتساب کے عمل کا پہیہ تیز کر دیا گیا۔ چاروں طرف پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور عہدیداروں کو گرفتار اور ہراساں کیا جانے لگا۔ اور ایک وقت تو ایسا آ گیا تھا۔ کہ جب "گلیاں سنجیاں" ہو گئی تھیں اور "مرزا یار" ہی دندناتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ردِ عمل عوام پر ہونا ہی تھا۔ ہمارے عوام کو تو دہری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو انفرادی سطح پر اس مہنگائی کے زمانے میں —— اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے ایک جانگسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد —— سیاست میں بھی اپنی وابستگیوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

جب کوڑا لہرایا اور برسنے لگا تو صورتِ حال اور بھی بگڑ گئی۔ بندوق سے نکلنے والی گولی —— حقیقی موت نہیں ہوتی۔ لیکن کوڑا یقینی طور پر جسم کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ادھر مخبری کا بازار بھی گرم تھا۔ "قومی اتحاد" والوں نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ یوں پیپلز پارٹی ہراساں ہو گئی۔ لیڈر بند۔ قائدِ عوام پر مقدمۂ قتل چل رہا تھا۔ عہدیدار بند۔ اور کارکن لرزاں اور ترساں کر دینے والی پالیسیوں کے سامنے مجبور و بے بس۔

اس کے ساتھ ساتھ بھٹو کے خلاف مہم اپنے عروج کو پہنچ رہی تھی۔ "رائیٹسٹ" پریس پورے مبالغے کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ بھٹو کی تمام ترخوبیوں کو یک قلم مسترد کر دیا گیا تھا۔ اور دانستہ یا دانستہ طور پر حکومت اس طرزِ عمل اور رجحان کی حوصلہ افزائی کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ "پھر ظلم کی داستانیں" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ساتھ ساتھ "وائٹ پیپرز" نے اخباروں اور رسالوں کے ورق کالے کرنے شروع کر دیئے۔

ان تمام پابندیوں اور مخالفتوں کے باوجود لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ کہ بھٹو کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ ایک تو بھٹو کی ذات پر لوگوں کا اندھا اعتماد تھا۔ پھر دنیا بھر سے غیرملکی سربراہوں کی اپیلیں آ رہی تھیں۔ اور عام کارکن تو ایک طرف خود پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے رہنما بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ بھٹو زندہ رہے گا۔ وقت کی بساط پر شطرنج کے مہرے جس طرح سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ اس کی طرف کسی کی نظر نہ جا رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان "مساوات" کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ آج کس غیر ملکی حکومت اور سربراہ نے بھٹو کی جاں بخشی کی اپیل کی ہے۔ ایسی اپیلوں کی خبروں کو بار بار شائع کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف وہ اخبارات جریدے جو بھٹو کو اپنی "فیورٹ ڈش" بنا کر کھا اور بیچ رہے تھے۔ ان کی ایک ایک سطر یہ فریاد اور مطالبہ کرتے ہوئے نظر آتی تھی۔ کہ جس شخص کے "سیاہ اعمال" کو ہم اس شد و مد سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کو پھانسی ملنی ہی چاہیئے۔ لیکن پیپلز پارٹی کے کارکن اوّل تو اس ساری پراپیگنڈہ مہم کو "خرافات" سمجھتے تھے اور پھر موازنے کے لئے یہ بھی سہارا تھا کہ جب دنیا کے سربراہ اور حکومتیں بھٹو کے لئے کوشاں ہیں تو ان "خرافات" کا کوئی کیا اثر لے سکتا ہے۔

ادھر پاکستان قومی اتحاد میں شامل جماعتیں بھٹو کو موت کی سزا دینے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ این۔ ڈی پی بعد میں قومی اتحاد سے علیحدہ ہو گئی۔ لیکن جب قومی اتحاد میں شامل تھی تو اس کے ایک سربرآوردہ رہنما جناب ولی خان یہ مطالبہ لے کر آئے تھے۔ کہ سب سے پہلے بھٹو کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ وہ اس سلسلے میں اس حد تک انتہا پسندی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کہ انہوں نے ملک کے تمام اہم مسائل اور امور کو یکسر نظر انداز کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اور یہ فرمایا تھا کہ بھٹو کو انجام تک پہنچا کر انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں۔

یہ آواز —— ایک "لیڈر" سے دوسرے "لیڈر" تک منتقل ہوتی رہی۔ مارشل لاء کی غیر منتخب حکومت کے رکن چوہدری ظہور الٰہی کا تو ایک ہی وظیفہ تھا۔ کہ بھٹو پھانسی پائے

گا۔ وہ پھانسی پر چڑھ کر رہے گا۔ اگر کسی نے بھٹو کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ اگر بھٹو کی جان بخشی ہو گئی — تو؟ اس سوال کے جواب میں وہ یقین دلاتے تھے۔ کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر جناب زاہد سرفراز (مارشل لاء حکومت کے سابق "سیاسی وزیر") نے تو یہ بھی فرمایا کہ اگر بھٹو کو چھوڑا گیا تو — اس کے فیصلے کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

آزاد اور ٹرسٹ کے اخبار اور ڈائجسٹ ہفت روزے — یہ اخبارات قیاس کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ کہ بھٹو کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کہ ایسے آدمی کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ سرکاری ذرائع ابلاغ، مذہبی مقامات اور عبادتگاہوں کے سربراہ، امام جمعوں کے خطبوں اور وعظوں میں کھلے ڈھلے لفظوں میں بھٹو کو پھانسی دینے پر زور دے رہے تھے۔ اس سارے مخالف ماحول میں پیپلز پارٹی کے کارکن ایک طرف تو اپنے آپ کو بے بس و مجبور پا رہے تھے۔ اور عام انسانوں کی طرح زندگی کی روزمرہ کی جدوجہد سے بھی گزر رہے تھے۔ اور پھر اس لئے بھی آواز نہ اُٹھا سکتے تھے۔ کہ فوجی حکومت ایسے تمام انتظامات کر چکی تھی۔ کہ ایسی کوئی آواز نہ اُٹھنے دی جائے جو بھٹو کے حق میں ہو۔

اُس نے محروم طبقوں کو سر اٹھا کر چلنا سکھایا

پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ، اتحاد کے بیشتر کارکن اور وہ لوگ جو کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اس خوش فہمی کا شکار تھے۔ کہ جس شخص کی جان بخشی کے لئے پوری دنیا سے اپیلیں جاری ہیں۔ اس شخص کو سزا تو ہو سکتی ہے لیکن اُس کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ لوگ بھی جو بھٹو کی موت کے خواہاں تھے۔ اور جو بھٹو کی موت کو اپنا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔ انہیں جب بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی خبر ملی تو ایک بار چکرا کر رہ گئے۔

کیونکہ فوجی حکومت نے جس ڈرامائی اور پر اسرار انداز میں بھٹو کو پھانسی دی تھی وہ واقعی حیران کن تھا۔

ہم ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہیں ملک کا مفاد ہر حال میں عزیز ہے۔ جو وطنِ عزیز میں توڑ پھوڑ کی سیاست کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ جو ہر سیاسی جماعت کے کارکن کی جان کو یکساں طور پر قیمتی اور عزیز سمجھتے ہیں۔ اتحاد کے کسی کارکن کو چوٹ لگے یا وہ گولی کا نشانہ بنے تو ہمارا دل اسی طرح دکھتا ہے۔ جس طرح پیپلز پارٹی کے کسی کارکن کی گولی کھا کر ہلاکت ہو جائے تو دل میں دُکھ کی لہر اُٹھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں سیاست اور احتجاج کے نام پر اتنی توڑ پھوڑ کئی برسوں سے مسلسل ہوتی رہی ہے کہ ہمارا غریب ملک کسی چیز کے زیاں اور نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

شرپسند عناصر — خواہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں اُن کی مذمت کرنی چاہیئے۔

لیکن — پُرامن احتجاج کا حق ساری دنیا کے انسانوں کو حاصل ہے۔ ساری دنیا کے انسان اس بنیادی حق کے مالک ہیں کہ وہ کسی فیصلے کے خلاف اپنی ناراضی یا رضامندی کا اظہار کر سکیں۔ انسانوں کے لئے — اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اور ذریعہ نہیں ہے۔ کہ وہ جلوس کی صورت میں احتجاج کرتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ اپنا یہ حق استعمال ہی نہ کر سکتے تھے۔ ورنہ جہاں جہاں لوگ انصاف اور قانون کے فیصلے سے پہلے بھٹو کی موت کے لئے پراپیگنڈہ کر رہے تھے۔ وہاں ان لوگوں کو بھی بھٹو کی پھانسی کے خلاف احتجاج اور فریاد کا حق ملنا چاہیئے تھا۔ جو بھٹو کے پرستار تھے۔ جو اس کی زندگی چاہتے تھے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کے لئے گنجائش ہی نہ چھوڑی گئی تھی۔

اس لئے یہ بات اب کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بھٹو اپنے مخالفوں کے لئے ایک پارس کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یہ پارس جس کو چھو گیا وہ سونا بن گیا۔ بھٹو کی مخالفت، بھٹو پر الزام تراشی کی مہم میں مردہ اخبار — زندہ ہو گئے۔ برسوں سے سوتے ہوئے ہفت روزے جاگے اور جنگِ زرگری میں شریک ہو گئے۔

اخلاق، آداب اور شرافت کے تمام اصولوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اور بھٹو کا گوشت لفظوں کی صورت میں بیچا اور کھایا جانے لگا۔ اس کی ذات، اس کی زندگی اور اس کی موت کی کہانیاں بنائی اور گھڑی جانے لگیں۔ اسی کے نام پر رسوائی کا بازار گرم ہوا۔ کوئی تیر ایسا نہ تھا۔ جو اس پر نہ چلایا گیا۔ کوئی زخم ایسا نہ تھا۔ جو اُسے نہ لگایا گیا۔ اُسے ہر رسوائی کی کہانی کا عنوان دیا گیا۔ جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر اب تک ذرا ان ڈائجسٹ اخباروں اور ہفت روزوں کے موضوعات پر ایک نظر ڈالئے۔ تو ساری صورتِ حال عیاں ہو جاتی ہے۔

بھٹو کے لئے کسی کے دل میں رحم نہ تھا۔ انصاف نہ تھا۔ اُس کی ذات میں ان لوگوں کو کوئی خوبی دکھائی نہ دی۔ اس کی سب خوبیاں برائیاں تھیں۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو بھی ان لوگوں نے نہیں بخشا۔ اب بھی اس کی برائیاں جاری ہیں۔

ہم نہیں کہتے کہ بھٹو فوق البشر تھا۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ بھٹو "مومن" تھا۔ اُس میں بہت سی خرابیاں ہوں گی۔ بہت سی برائیاں ہوں گی۔ لیکن اس میں کچھ — تھوڑی سی خوبیاں بھی تو ہوں گی۔ اچھائیاں بھی تو ہوں گی۔ کبھی ان کو بھی یاد کر لیجئے۔ اخلاق حسنہ اور بلند اور ارفع اصولوں کے پرچارک — یہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ کہ مرنے والے کا ذکر کم از کم اچھے انداز میں تو کر ہی لینا چاہیئے۔

لیکن جنہوں نے اخلاق اور آداب کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ جنہوں نے ایک "فیورٹ ڈش" تیار کی ہے۔ اور اُسے بازار میں بیچنے کے لئے لے آئے ہوں تاکہ چاندی بنا سکیں۔ وہ ان باتوں پر غور نہ کریں گے۔ وہ حقائق کو مبالغے اور اقدار کو سونے چاندی کی چوکھٹ پر قربان کرتے چلے جائیں گے۔ تاکہ اپنی جیب جب تک گرم رہ سکتی ہے۔ گرم رہے۔

کاش یہ لوگ — ایک بار سوچ سکیں کہ وہ جو بھٹو کے نظریاتی مخالف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظریاتی مخالف کو بیچ کر — کتنا فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور ایسا فائدہ ان کے مسلک میں حرام ہوتا ہے۔ یا حلال!!

اور جو "فیورٹ ڈش" انہوں نے بھٹو کے جسم و جاں اور ریشوں سے تیار کی ہے۔ اور اس سے انہوں نے صحافت کی دنیا میں جو "فوڈ پوائزننگ" کی ہے۔ اس کے نتائج کیا نکلیں گے!!

بھٹو کا اس طرح گوشت بیچنے والوں کا رویہ دیکھ کر جب مجھے منٹو کا ایشر سنگھ (ٹھنڈا گوشت) یاد آتا ہے تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ ایشر سنگھ میں تو پھر اتنی انسانیت تھی کہ وہ مردہ اور ٹھنڈے گوشت کو چھو کر حیوان سے انسان بن گیا تھا۔ لیکن یہ — گوشت بیچنے والے۔۔۔!! میں اب بھی تھرا رہا ہوں!!

بھٹو کا جشنِ مرگ

اخترالایمان نے جب کہا تھا ؏

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت، منائیں ہم

تو کچھ اور بات تھی۔ لیکن جب اخبار کے ضمیمے کی شکل میں۔ بھٹو کو پھانسی لگنے کی سناؤنی آئی تو 'بھٹو دشمنوں' نے جس طرح اس کی موت پر خوشی منائی۔ وہ کچھ اور بات تھی۔

اپنے دکھوں، اپنے غموں اور اپنی "موت" پر جشن منانے کا اہتمام کرنا۔ بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ دوسرے کی موت پر خوش ہونا، خوشیاں منانا۔ پرلے درجے کی ذلالت اور گھٹیا پن ہوتا ہے اور پھر جب اس حرکت کے مرتکب وہ لوگ ہوں جو اسلام کی سربلندی کے خواہاں دعویدار اور صالحیت کی نمائندگی کرتے ہوں تو — انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسی قبیح اور اتنی شرمناک حرکت کر سکتے ہیں ان سے عام زندگی میں خیر اور نیکی اور وسیع النظری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

بھٹو اور پیپلز پارٹی کو کافر قرار دیا جاتا رہا۔ مفتیانِ کرام نے عجیب عجیب فتوے جاری کیے اور پھر اسلامی رواداری اور انسانیت کا اس طرح بھی ثبوت فراہم کیا گیا کہ جب پیپلز پارٹی کا کوئی آدمی انتقال کر گیا تو محلے یا علاقے کے مولوی صاحب نے اس لیے اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا کہ متوفی کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا اور پیپلز پارٹی خواہ لاکھ 'اسلام ہمارا مذہب اور دین ہے' کا نعرہ لگائے اور خواہ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں، کلمہ پڑھتے ہوں۔ اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوں۔ لیکن ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا جنازہ پڑھانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

لیکن جنازہ پڑھانے سے انکار کرنا۔ اپنی جگہ کتنا بڑا غیر اسلامی اور غیر انسانی فعل کیوں نہ ہو۔ کسی کی موت پر خوشیاں منانے سے زیادہ بڑا فعل نہیں ہو سکتا۔

اور بھٹو کو پھانسی لگی تو یہ بھی ہوا۔

اس روز جہاں لوگ صدمے سے نڈھال نظر آ رہے تھے۔ ٹکڑیوں میں جمع ہو کر اس انہونی کے ہونی ہونے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے اور لوگ اشکبار تھے۔ سکتے کی کیفیت میں تھے اور بعض لوگ بڑبڑا کر، بعض چیخ کر اپنے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کر رہے تھے۔ اس روز ۴؍ اپریل ۱۹۷۹ء کو کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو بھٹو کو پھانسی لگنے پر خوش ہو رہے تھے۔

سنی سنائی پر میں خامہ فرسائی کروں تو شاید کچھ لوگوں کو اعتراض ہو لیکن آنکھوں دیکھی اور پڑھی لکھی آن دی ریکارڈ بات کروں تو شاید وہ جنہیں انسان کی بہیمیت اور سفاکی کے اس پہلو سے انکار ہو۔ وہ اسے تسلیم کر لیں۔

میں خود جس علاقے میں رہتا ہوں۔ وہ لاہور شہر کا ایک گنجان اور بڑا آباد علاقہ ہے۔ اس علاقے میں لاکھ سوا لاکھ انسانوں کی آبادی ہے۔ ہر علاقے کی طرح اس علاقے میں بھی ہر خیال، عقیدے اور ذہن کے لوگ ہیں۔ یہاں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں اور جہاں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو کسی آبادی کی تشکیل کرتے ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو اپنے آپ کو ذہنی طور پر بہت سی باتوں کے لیے تیار رکھتے ہیں۔ میں 'مدمقابل' کو کبھی انڈر ریٹ نہیں کرتا۔ اسی لیے ہمارے ملک میں جولائی ۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد جو صورتِ حال تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں نے ان قوتوں کے رویے کا اندازہ کرتے ہوئے، جو بھٹو کے مقابل تھیں۔ بہت پہلے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ

> یہ ممکن نہیں رہا کہ — اب بھٹو جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے زندہ سلامت باہر آئیں۔

میں غیر جانبدار بھی نہیں ہوں اور کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا ہوں۔ میں اس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں جس کا وجود اس ملک میں نہیں ہے۔ لیکن اپنی انفرادی سطح پر ادب اور انسانی تاریخ کے ایک طالب علم اور ایک معمولی سے لکھنے والے کی حیثیت سے میں اپنے آپ کو معروضی حالات کے سپرد کر دیتا ہوں اور حق کا ساتھ دیتا ہوں۔ بے انصافی کے خلاف بولتا ہوں۔ اپنی تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود یہ بات بڑی عاجزی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں منافق نہیں ہوں۔

مختلف جرائد سے تعلق رکھنے کی وجہ سے۔ میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکا۔ جرائد کے مالکوں کی پالیسی اور حکمتِ عملی مجھ پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشنوں میں میں نے پوری قوم کی طرح یا قوم کی اکثریت کی طرح بھٹو کو ووٹ دیا۔ لیکن میں ہمیشہ سے بھٹو پر اس نظریے سے معترض رہا کہ وہ فیوڈل لارڈ ہیں اور جس سیاست کو لے کر وہ آئے ہیں اس سیاست کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ڈی کلاس کریں۔ ایسا کرنا شاید بھٹو کے لیے ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اپنی سیاست کے حوالے سے نچلے طبقوں، کسانوں اور مزدوروں میں شعور اور بیداری کی لہر دوڑا دی ان کے بعض کارنامے پاکستان کی تاریخ میں یکتا اور [illegible] اور بے مثال ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ساتھ مجھے اختلاف بھی رہا۔ میں نے ان کی پالیسیوں پر تنقید بھی کی اور یہ جمع زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ بلکہ آج بھی وہ سب الفاظ اور تحریر کی صورت میں محفوظ ہے۔ لیکن بھٹو کے بارے میں تمام تر اختلافات کے باوجود یہ بات ذہن میں راسخ ہو چکی تھی۔ کہ وہ تنگ نظروں اور متعصب سیاست دانوں کے مقابلے میں روشن دماغ اور عوامی سیاست کے بانی ہیں۔

بھٹو کی مخالفت کا جس طرح سے "رائیٹسٹ" پریس نے ان کی گرفتاری، مقدمۂ قتل، سزا اور پھانسی کے بعد بھی پروپیگنڈہ کیا گیا۔ وہ حیران کن، شرمناک، اور انتہائی غیر مہذب انداز کا حامل تھا۔ اسی دوران میں حالات کی تبدیلی نے مجھے سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ میں بھٹو کو پھانسی لگنے سے پہلے بہت پہلے۔ مدمقابل کے رجحانات اور رویوں کو سمجھتے ہوئے یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ

> بھٹو کو اب زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔

اس لیے میں ذہنی طور پر بھٹو کی موت کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔ اس کے باوجود جب میں نے بھٹو کو پھانسی لگنے کی خبر۔ "نوائے وقت" کے ضمیمے کے حوالے سے پڑھی تو میں چکرا کر رہ گیا۔

شاید میں نے جو لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ میری صحیح ذہنی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتا۔

مجھے یاد ہے کہ میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ سڑک پر کچھ لوگ کھڑے پھانسی کی بات کر رہے تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی ادھ سنی باتوں پر توجہ نہ دی۔ چلتا رہا۔ پھر ضمیمہ بیچنے والے کی آواز سنائی دی۔ جس میں 'کراراپن' نہ تھا۔ بلکہ کچھ ندامت اور خفت کا سا انداز تھا۔

میں نے ضمیمہ خریدا۔ سرخی پر ایک نظر ڈالی۔ اور واپس اپنے گھر آ گیا۔

میرے بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ میری بیوی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ضمیمہ تھاما اس کی سرخی پڑھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر دھواں نگلنے اور اگلنے لگا۔ اب سکتے، جمود اور حیرت کی سطح ٹوٹ رہی تھی۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر کچھ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اپنے اندر کسی چیز کے سمٹنے، سکڑنے اور سہم جانے کی کیفیت کو محسوس کرتا رہا۔ پھر خود بخود میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

بچے اپنی ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ان کے لیے یہ منظر واقعی ناقابلِ یقین تھا کہ ان کے ابّو اور امی کے درمیان کوئی نرم گرم مکالمہ بھی نہ ہوا تھا۔ پھر بھی امّی رو رہی تھی...!

بچے سہمے ہوئے تھے!

یکدم مجھے احساس ہوا کہ فضا میں گھٹن بڑھ گئی ہے۔ دم گھٹنے لگا ہے۔ دل پر شدید اور بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔ ایک عجیب طرح کی وحشت طاری ہو رہی تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر اپنے بچوں اور بیوی سے کچھ کہے بغیر میں گھر سے باہر نکل آیا۔

اب میرے اندر جھکڑ چلنے لگے تھے۔ آندھی کی رفتار دل میں بہت تیز ہو گئی تھی۔

ایک عرصے سے دوسروں سے اُلجھنے والے، دوسروں کو یقین دلانے والے شخص کا اس وقت جو حال تھا وہ میرے لیے بھی کچھ غیر متوقع تھا۔ میں تو لوگوں سے الجھتا رہتا تھا اب بھٹو زندہ نہ رہیں گے۔ وہ جیل اور پھانسی کی کوٹھڑی سے زندہ نہ آئیں گے۔ وہ لوگ میرے ساتھ لڑتے، الجھتے اور جھگڑتے تھے۔ لیکن میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کہ اب بھٹو کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس سارے پس منظر اور ذہنی تیاری کے باوجود — اب میری اپنی ذہنی حالت یہ تھی

کہ مجھے بھٹو کی موت، اس کے پھانسی لگنے کی خبر پر یقین نہ آ رہا تھا۔

میری ساری معروضیت اور عقلیت پسندی دھری کی دھری رہ گئی تھی اور میں اس خبر پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ اصل میں، میں اپنے آپ کو یہ تسلیم کرانے کے لیے تیار نہ تھا کہ بھٹو کو پھانسی ہو گئی ہے۔ اب وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ خاک کے اوپر نہیں بلکہ خاک کے نیچے جا چکا ہے۔

لیکن جلد ہی مجھے نہ صرف یہ کہ بھٹو کی موت اور اس کی تدفین کا یقین آ گیا بلکہ انسانی شخصیت اور سفّاکی کا بھی ایک انوکھا، ناقابلِ یقین رُخ دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں اسے دیکھ کر بھٹو کی موت کے صدمے کو بھول کر اور باتوں میں الجھ کر رہ گیا۔

اس آبادی میں — جہاں میں رہتا ہوں — پیپلز پارٹی کے علاقائی چیئرمین کی دکان بند تھی!

اس علاقے میں قومی اتحاد کے صدر جو ایک جنرل مرچنٹ ہیں۔ ان کی دکان کھلی تھی اور ان کی دکان ہی میں علاقے کے قومی اتحاد والوں کا دفتر بھی ہے۔

اس دفتر میں لوگ جمع تھے۔ میں نے قہقہوں کی آواز سنی اور میں رُک گیا۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی۔ کہ اس ملک کے منتخب وزیرِ اعظم، صدر متفقہ آئین کے خالق کو اچانک، یکدم، حیران کن، غیر متوقع طور پہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ اور لوگ قہقہے لگا رہے ہیں۔

اندر سے قہقہے بدستور سڑک تک آ رہے تھے۔

میں جو رُک گیا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر قدم آگے بڑھائے۔ اب میں قومی اتحاد کے دفتر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے، لڈو کھا رہے تھے۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے مجھے دیکھا۔ اندر آنے کی دعوت دی۔

میں اپنے آپ سے نادم، خجل، الٹے قدم پیچھے ہٹا۔ اور ایک آدمی سے ٹکرایا۔

ان صاحب کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ گرتے گرتے بچا۔ وہ ہانپ رہے تھے۔ جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں غلطی نہ ہوئی کہ وہ بڑی تیزی سے چلتے آئے تھے۔ جب میں دفتر سے نیچے اتر کر سڑک پر قدم رکھ رہا تھا تو مجھے انہی کی پرجوش آواز سنائی دی۔

"مبارک ہو۔ بھٹو کو پھانسی ہو گئی۔"

"آپ کو بھی مبارک ہو....."

"مبارک ہو... مبارک ہو" آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

میں بھول گیا کہ میں چند منٹ پہلے کس ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ اب بھٹو کی موت، اس کو پھانسی پر لٹکائے جانے کا۔ مجھے پورا یقین ہو چکا تھا۔ جو چیز، میرا دل، میرا ذہن قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ جیسے قبولیت کی راہ میں مزاحمت پیدا کر رہا تھا۔ خود بخود اس کو میرے حواس، ذہن، دل اور دماغ نے قبول کر لیا۔

اور دل میں ایک عجیب طرح کی افسردگی کے باوجود میں ایک طنز سے بھری تلخی محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں اپنے ہم وطنوں، ہم مذہبوں، اور انسانوں کے لیے افسردگی اور طنز پیدا ہوئی تھی۔

وہ لوگ جو سڑک پر جاتے ہوئے جنازے کو دیکھ کر۔ خاموش ہو جانے کے عادی تھے۔ جو آگے بڑھ کر کندھا دیا کرتے تھے۔ جو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا عَلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا کرتے تھے۔ کسی کی میّت، کسی کی موت کی خبر سن کر جن کے ہونٹ آیاتِ قرآنی کا وِرد کرنے لگتے تھے۔ جو کسی کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ جن کی روایات یہ تھیں کہ —

کسی مرے ہوئے شخص کو برا نہ کہا جاتا تھا۔ اس کی برائیوں کے ذکر سے اجتناب کیا جاتا تھا۔

جس کی بُری حرکات سے چشم پوشی کا وطیرہ اختیار کر لیا جاتا تھا۔

جو لوگ مرنے والے شخص کی ہر حرکت کو بھلا کر اس کی مغفرت کی دعا کرنے کی روایت میں جکڑے ہوتے تھے۔

وہ لوگ — ہر روایت کو توڑ کر — آزاد ہو گئے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ موت کے خوف سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ جیسے یہ موت انہیں، ان کے پیاروں کو کبھی نہ دبوچ سکے گی۔ وہ لوگ۔ جن کا مذہب، جن کا اخلاق، جن کا معاشرتی رویّہ۔ انہیں کچھ اور کرنے کی صدیوں سے تعلیم دیتا رہا ہے وہ اسے نظر انداز کر کے، قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ بھٹو کے پھانسی لگ جانے کی خوشی میں لڈو بانٹ رہے تھے...

مجھے بھٹو کی موت سے بھی زیادہ بڑے صدمے نے ہلا کر رکھ دیا!

احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر۔ ضرب المثل بن چکا ہے، مجھے یاد آنے لگا۔ ندیم صاحب کو شکایت تھی کہ وہ لوگ جو عمر بھر سنگ زنی کرتے رہتے ہیں۔ وہ عیب اپنے بدن کو دفن کرتے ہیں تو اعزاز کے ساتھ۔ لیکن۔ بھٹو کو کوئی اعزاز سے کیا دفن کرتا مرنے کے بعد بھی اس پر سنگ زنی کا عمل جاری رہا۔ اس کی موت پہ قہقہے لگائے جاتے رہے۔

اور اگلے دن میں اخبار میں۔ جناب محمود اعظم فاروقی (جو اس وقت جماعت اسلامی کی طرف سے مرکزی وزیر اطلاعات تھے) کا بیان پڑھ رہا تھا۔ جنہوں نے بھٹو کی موت پر خوشیاں منانے کی مذمت کی تھی اور اس پہ دکھ کا اظہار کیا تھا۔

لیکن۔ وہ جنہوں نے بھٹو کی موت کا۔ جشنِ مرگ منایا۔ وہ تو اپنی سی کر چکے تھے اور یہ بھی بھول گئے تھے کہ ع

دشمن مرے تو خوشی نہ کریئے۔ سجناں وی مر جاناں ہو!!

مُردہ بُھٹو

زندہ بُھٹو

سقراط نے زہر کا جام پیا۔ اور مر کر زندہ ہو گیا۔

مسیحؑ کے لئے صلیب تھی۔ وہ مصلوب ہوا اور لازوال ہو گیا۔

سیدنا امام حسینؑ نے کربلا میں شہادت پائی اور ’دین پناہ‘ بن گئے۔

یہ بڑے لوگ تھے۔ لیکن موت ...... ’غیر طبعی موت‘ — عام آدمیوں کو بھی نہیں مار سکتی۔ تاریخ میں ایسے کتنے ہی نام ملتے ہیں۔ جو نہ ’دیوتا‘ تھے، نہ پیغمبر، نہ مقدس، بس عام آدمی تھے۔ لیکن اپنی روشنئ طبع اور سچائی کے ہاتھوں مارے گئے۔ اور زندہ رہے۔ ایسے لوگوں کی بھی مثالیں کم نہیں ہیں۔ جنہوں نے آخری لمحوں تک اپنے جرم کا اعتراف نہ کیا۔ رحم کی درخواست نہ کی اور جلا دیئے گئے، زندہ دفن کر دیئے گئے۔ سولی پہ لٹکا دیئے گئے۔ لیکن زندہ رہے۔ ان کے نام جریدہ عالم پہ اس طرح ثبت ہوئے کہ دوام ہو گئے۔

منصور حلاج — سینہ چاک کھڑا ہے۔ عضو عضو کٹ گیا ہے....

قرۃ العین طاہرہ — اندھے کنوئیں میں لٹکا دی گئی۔

اسی صف میں کہیں برونو کھڑا ہے۔ جسے لکڑی کے ساتھ باندھ کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ کہیں لومبا موت سے لپٹ کر ابدی شہرت سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ کہیں والٹیر کھڑا ہے۔ جو اپنے زمانے کا ذہین ترین انسان تھا۔ اور جب وہ مرا تو اس کو فرانس میں دفنانے کی اجازت نہ ملی۔ ۱۷۹۱ء میں جب اس کا جسد خاکی پیرس لایا گیا تو اُسے قومی ہیرو کا اعزاز دیا گیا۔ اور اس کا جسد خاکی لگ بھگ بیس برسوں کے بعد — پیرس واپس آیا تھا۔ ان میں کہیں جولیس فیوچک ہے۔ جو پھانسی کا پھندہ چوم رہا ہے۔ اور کہیں رالف فاکس ہے۔ جو جمہوریت کے لئے جنگ لڑتے ہوئے مارا گیا ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں۔ جن کی بزم طرب میں حیات بٹتی ہے۔ اور بقول فراق صاحب،

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی!

اور کوئی حسن ناصر ہے۔ جو گھر سے، ماں سے دُور آ کر ہمارے لیے جان دے دیتا ہے۔ اور بوڑھی ماں کو اس کی جو قبر دکھائی جاتی ہے۔ وہ اس کے بیٹے کے قد سے چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس ساری بربریت کے باوجود حسن ناصر زندہ رہتا ہے۔

اسی صف میں کہیں — ٹامس مُور کھڑا ہے۔ پھانسی پہ لٹکایا گیا۔ مر چکا ہے لیکن آج بھی وہ ”دی مین فار آل سیزنز“ کی حیثیت سے زندہ ہے۔

اور یہ — ریڈرینی لیکوریڑ ہے۔ اداکارہ تھی۔ اور جس دور میں وہ زندہ رہی اور مری۔ اس دور کے فرانس میں اداکاری کو شرمناک پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اور وقتِ مرگ پادری کا اصرار ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اپنے پیشے پر لعنت بھیجیں۔ ندامت اور گناہ کا اعتراف کریں کہ وہ ایسے پیشے سے ملوث تھے۔ لیکن ایڈرینی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے انسانوں کی دی ہوئی ”بخشش“ قبول نہ کی۔ پادری بغیر دعا کے چلا گیا۔ وہ مر گئی۔ اب اُسے کوئی کفنانے دفنانے پہ آمادہ نہ تھا۔ پولیس نے لاش کو ایک گڑھا کھود کر اس میں ڈالا اور اس کے اوپر چونا ڈال دیا۔ لیکن — وہ آج بھی زندہ ہے۔ کیونکہ انسانوں کے حافظوں اور کتابوں کے اوراق میں زندہ ہے۔

بعض لوگ — کسی اور حوالے سے بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ اور ہم ان کے چہروں اور ناموں سے واقف نہیں ہوتے لیکن وہ یاد آتے ہیں۔ وہ مر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن زندہ رہتے ہیں۔

بھٹو مر گیا۔ اسے پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔ لیکن وہ زندہ ہے... اور زندہ رہے گا۔

بھٹو کی موت کے حوالے سے — مجھے آرتھر ملر کا المیہ ”دی کرا سیبل“ یاد آ رہا ہے۔ جہالت، سرمایہ داری، توہم پرستی نام نہاد مذہبیت کے خلاف اس سے زیادہ موثر اور بڑا کھیل نہیں کھیل گیا۔ (اور شاید یہی وجہ ہے کہ بقول ٹینن اس کھیل کے بعد امریکی سرکار نے بھی کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ براڈوے کی سٹیج پہ کوئی سیاسی ڈرامہ نہ کھیلنے دیا گیا۔)

آیئے اور اس کھیل کے آخری اور چوتھے ایکٹ کے کچھ ٹکڑے پڑھیں۔

ڈینفورتھ (یہ گورنر ہے اور عدالت کا منصفِ اعلیٰ بھی تھا) اپنے ایک نائب سے کہتا ہے۔

”میری بات غور سے سنیئے۔ اپنے آپ کو متفکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایسی کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جس کی رُو سے ان کو معاف کیا جا سکے یا سزا کو ملتوی کر دیا جائے۔ وہ سب لوگ جو اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتے۔ ان کو پھانسی دے دی جائے گی — نمکین آنسوؤں کا سمندر ریاست کے فیصلوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔“

پراکٹر:۔ اس المیہ کا ہیرو ہے۔ اُسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اعتراف جرم کرے لیکن وہ نہیں مانتا۔ صبح ہو رہی ہے اور اُسے سورج نکلنے سے پہلے پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہے۔ زندگی کے آخری لمحوں میں اُس کی اپنی بیوی الزبتھ سے ملاقات کرائی جاتی ہے۔ اس گفتگو کے کچھ ٹکڑے....

پراکٹر:۔ میں کسی ولی کی طرح پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھ سکتا۔

الزبتھ:۔ آج تک تم نے اعتراف کیوں نہیں کیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اچھے آدمی ہو۔

پراکٹر:۔ کتوں کے سامنے جھوٹ بولنا بھی بڑا مشکل ہو جاتا ہے.... میں چاہتا ہوں کہ اس بات میں جو تھوڑی سی سچائی ہے۔ تم اسے دیکھ سکو..... وہ جنہوں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ وہ اپنی رُوحوں کے لئے مر چکے ہیں۔ مر رہے ہیں۔ ”یہ نام ہے..... میرا نام..... پراکٹر۔ اس نام کو مجھے زندہ رکھنا ہے۔ اس لئے کہ میں اپنی زندگی میں دوسری بار یہ نام حاصل نہ کر سکوں گا۔ میں اپنے نام کے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گا۔

پراکٹر (گورنر اور منصفِ اعلیٰ سے مخاطب ہوتا ہے)

”ہاں میں پھانسی پہ چڑھ سکتا ہوں۔ تم نے اپنا طلسم یہاں دکھا دیا۔ مگر میں جان گیا ہوں کہ مجھ میں اب بھی نیکی کی رمق باقی ہے۔ میرے اندر نیکی کا جو چھوٹا سا دھاگہ ہے۔ تم اُسے پرچم نہیں بنا سکتے۔ مگر وہ اتنا سفید اور بے داغ ہے کہ تم اس کی رنگت تبدیل نہ کر سکو گے۔

(بیوی کا ہاتھ تھامتا ہے۔ جو آنسو بہا رہی ہے۔ اُسے کہتا ہے)

”انہیں آنسو مت دکھاؤ۔ یہ آنسو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ انہیں پتھر کا دل دکھاؤ.....“

بھٹو نے ایک بار کہا تھا۔

”میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے کی بجائے فوج کے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دوں گا۔“

بھٹو کو تاریخ کے ہاتھوں موت نہیں آئی!!

جیل میں پھانسی کی کوٹھڑی میں بھٹو نے بارہا یہ خواہش کی ہوگی کہ اسے آزادی نصیب ہو۔ وہ پھر کھلی اور آزاد دنیا میں آتے۔ ایک بار اس کی آواز دنیا سنے۔ ایک بار پھر زندگی کے میدانِ کارزار میں اترے۔ اور یقیناً اس نے مایوسی کے عالم میں کئی بار اپنی مرضی کی موت کی دعا بھی کی ہوگی۔ بیکٹ نے دُعا کی تھی۔

”اے خدا۔ تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔
اب موت میری مرضی کے مطابق بخش دے۔
تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند“!

اور اس دنیا میں جہاں انسان۔ کو نہ پیدائش پر قدرت حاصل ہے نہ موت پر۔ کتنے انسان ہیں۔ جنہیں یہ دعا کرنے کی ہمت نصیب ہوتی ہے اور کتنے خوش نصیب ہیں جنہیں ان کی مرضی کی موت نصیب ہوتی ہے۔ وہ جس نے فوج کے ہاتھوں مرنا پسند کیا تھا اور جسے تاریخ کے ہاتھوں مرنا پسند نہ تھا۔ اسے اپنی مرضی کی موت ملی ہے۔ کیونکہ تاریخ اس کی موت کے پروانے پر دستخط کرتی تو اس کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ تاریخ نے اسے زندہ رکھا ہے، اس نے خود اپنی حیاتِ نو اور ابدی زندگی کے لیے تاریخ لکھی اور بنائی ہے۔ اس نے اقرارِ جرم نہ کیا۔ اس نے رحم کی اپیل نہ کی۔ وہ جب تک زندہ رہا۔ اسی بات پر مصر رہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ عدالتوں نے اسے مجرم ثابت کیا اور پھر اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

اس کی موت نے افواہوں اور شبہوں کو جنم دیا ہے۔ وہ دو انتہاؤں پہ کھڑا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک استعارے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بھٹو دو دنیاؤں کے سنگھم پہ کھڑا ہے۔ ایک دُنیا ہے جو اس کے ساتھ مر گئی ہے اور ایک دنیا ایسی ہے جس نے اس کی موت سے جنم لیا ہے۔ یوں وہ ایک رزمیہ کا کردار بنتا ہے۔ ایک لیجنڈ بن جاتا ہے اور یوں ایک لیجنڈ کی حیثیت سے اسے ختم کرنا۔ اسے بھلا دینا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔

پابلو نرودا نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا۔

اب مجھ پر کشف ہوا ہے کہ میں ”ایک“ نہ تھا۔
بلکہ ”ایک“ میں ”کئی“ تھا۔
اور میں کئی بار مر چکا ہوں۔
اور نہیں جانتا کہ میں نے کیسے دوبارہ جنم لیا۔
سوائے۔ اس ایک احساس کے،
جس طرح آدمی کپڑے بدلنے پر مجبور رہتا ہے۔
ایسے ہی میں ایک دوسری زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوں۔
نسیان کے اس زمانے میں۔ صرف میں زندہ ہوں۔
اور سارا شہر مجھے دیکھ رہا ہے۔
اور یہ ”میں“ ہوں جو مر چکا ہے:
اور شہر زندہ ہے“!

وہ جو ایک سے کئی ہوتا ہے۔ وہ کئی بن کر —— ہزاروں لاکھوں میں زندہ رہتا ہے اور وہ ایک ایسی روایت کا بھی حصہ بن جاتا ہے جو بڑی اور قربانی کی روایت ہوتی ہے۔ جس میں زندہ کارنامے سرانجام دینے والے انسان —— یوں تو فنا کے گھاٹ اترتے ہیں۔ لیکن زندہ رہتے ہیں۔ یہ اس روایت کا جبر ہوتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی نئی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور پابلو نرودا کی یہ لائین بھی تو دیکھئے کہ وہی لوگ ہیں جو نسیان کے اس زمانے میں بھی —— زندہ رہتے ہیں اور جو مرنے کے بعد ”شہر“ (جو ”کئی“ کا مجموعہ ہوتا ہے) بن جاتے ہیں اور شہر زندہ رہتے ہیں۔

اس لیے زندہ بھٹو کو مردہ نہ سمجھئے۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا۔ بھٹو کا مقدر رہے۔ اس کی ”مجبوری“ ہے۔

بھٹو کو زندہ قرار دیتے ہوئے میں کسی بغاوت کا ارتکاب نہیں کر رہا۔ نہ ہی قانون کی حرمت کو چیلنج کرنے کا سزاوار ہوا ہوں۔ کیوں کہ۔ سب سے بڑا خدا کا قانون ہے اور سب سے بڑی عدالت خدا کی ہے۔ وکٹر ہیوگو نے عدالت میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔

”قانون سازی کا مشکل عمل دو قسموں پر منقسم ہوتا ہے۔ مقننہ اور اخبارات۔ اخبارات کا فرض ہے کہ وہ قوانین پر نکتہ چینی کرے اور اس نکتہ چینی سے مقننہ کو قانون سازی میں مدد دیں۔

ایک لکھنے والے کی حیثیت سے ایک قلمکار کی حیثیت سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں نے جو کچھ دیکھا، سمجھا، محسوس کیا وہ لکھ دوں۔ میں قانون دان نہیں ہوں نہ ہی قانونی موشگافیوں کو جانتا ہوں۔ میں اپنے عصر اور عہد کی روح کو سمجھنے کا تھوڑا سا دعویٰ کرتا ہوں۔ ادب کا جتنا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اور انسانی تاریخ کا جس حد تک علم میرے حصہ میں آیا ہے۔ میں تو اسی کے بل بوتے پہ بات کرتا ہوں اور اسی کے حوالے سے میں ”مردہ بھٹو“ کو مردہ نہیں سمجھتا، میں اسے زندہ سمجھتا ہوں۔

اس کو پھانسی پہ لٹکا یا گیا۔ کیونکہ —— اس نے قتل کیا تھا؟ اس نے ایک شخص کو قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ عدالتوں نے قانون نے اسے مجرم قرار دیا، لیکن اگر اس کی خدمات، اس کی جان بخشی کے لیے کی جانے والی دنیا بھر سے آنے والی اپیلوں کو مدِنظر رکھا جاتا تو اسے موت کی سزا سے بچایا جاسکتا تھا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ اس کی سزا میں تخفیف کی جاسکتی تھی، لیکن ایسا نہ ہوا۔

قتل —— بڑا بھیانک اور سب سے بڑا جرم ہے، لیکن دنیا میں قتل ہوتے رہتے ہیں اور قاتل بچ جاتے ہیں۔ بعض قاتلوں کو خود خدا نے زندہ رکھا۔ کیونکہ ان سے وہ بڑا کام لینا چاہتا تھا۔ میں تاریخ اور مذہب کے ایسے معاملوں اور نازک مسئلوں کو چھیڑنے کا اہل اپنے آپ کو نہیں پاتا ہوں، لیکن ایسے کیا کیجیے کہ یہ سارے مسئلے میرے علم اور آپ کے مطالعے میں ہیں اور انسانی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

”دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان“ والے ”دس احکام“ خدا نے اپنے جس عظیم پیغمبر پر نازل کیے۔ وہ جب نبوت کے مرتبے پر فائز نہ ہوئے تھے تو ان سے بھی اشتعال میں ایک قتل ہو گیا تھا۔

حضرت موسیٰ کا یہ واقعہ مذہبی کتب میں موجود ہے کہ کس طرح ایک شخص کی بداخلاقی اور اشتعال انگیز گفتگو سے وہ بھڑکے اور اس شخص کو تھپڑ دے مارا۔ جس کے نتیجے میں وہ شخص مر گیا، ہلاک ہو گیا اور حضرت موسیٰ اس خوف سے مصر سے بھاگ نکلے کہ ان سے پوچھ گچھ ہو گی اور انہیں سزا دی جائے گی۔ اور یہی موسیٰ —— جو بعد میں طور پہ گئے اور پیغمبری پائی اور ”جلتی جھاڑی“ کو دیکھ کر خدا کے نور سے قریب ہوئے اور خدا کے نبیوں میں سے ایک ہیں اور جن پر ایمان لانا ہمارا فرض اور عقیدے کا اہم حصہ ہے۔ اپنی جوانی میں —— ایک شخص کی موت کا سبب بنے تھے۔

میں پھر —— اس بات کا اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ایسے مسئلے ہیں۔ جن پر کچھ لکھنے اور کہنے کا میں اہل نہیں۔ میں تو بھٹو جیسے ”خطاکاروں“ کے بارے میں ہی کچھ کہہ سکتا ہوں کہ جو تمام بشری خامیوں کے مالک تھے۔ برائیاں بھی ان میں تھیں۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں ہی ایک علامت بن گئے تھے اور استعارہ ان کو ان کی موت نے بنا دیا۔ تو ایسے لوگ مردہ نہیں ہوتے۔ وہ زندہ ہوتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔

اس لیے وہ مرتے نہیں ہیں!!

اور بھٹو بھی مرا نہیں۔ حالانکہ اس کا وجود مر چکا ہے۔ لیکن وجود سے ماورا جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ زندہ ہے۔

اور جس طرح اس کو زندگی ہم سب کے رب نے دی تھی۔ اسی طرح سے مرنے کے بعد بھی یہ زندگی اس کے رب کی دین ہے اور وہی سب جہانوں کا مالک اور علیم و خبیر ہے اور وہی فانی انسانوں کو بھی ابدی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے!!

ECFI

ایکسپریس سے اسلامی تعاون کا مطلب معیشت کا فروغ

ایکسپریس کمرشل فنانس انٹرنیشنل لمیٹڈ

۴۔ اے۔ ۳۔ گلبرگ III ۔ لاہور۔ ٹیلیفون: ۸۸۱۵۴۶

پاکستان میں بلاسود سرمایہ کاری کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ادارہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۸۱۳۷

اِسی ضخامت میں، اسی پالیسی کے ساتھ

پندرہ روزہ

قافلہ

ہر ماہ کی یکم اور پندرہ کو باقاعدگی سے شائع ہوا کرے گا۔

پندرہ روزہ قافلہ

- ہمسفروں، ہموطنوں کے مسائل اور دکھوں کی نشاندہی کرے گا۔
- سچ اور حق کی ترجمانی کرے گا ——
- آپ کو وطن عزیز اور ساری دنیا کے حالات سے باخبر رکھے گا۔
- آزادیِ اظہار اور انسانی حقوق کی جدوجہد کرے گا۔

پندرہ روزہ قافلہ

میں آپ وہ سب کچھ پائیں گے، جو آپ کے ذہن میں سوال بن کر اُبھرتا ہے جو آپ کی سوچوں اور آپ کی امنگوں پر مشتمل ہے۔

پندرہ روزہ "قافلہ"

کا ہر شمارہ اپنے موضوعات کی نُدرت، خیالات کی صفائی اور حق گوئی کی روشنی سے آپ کو متاثر کرے گا۔

قافلہ —— آپ کا ہے —— کیونکہ آپ خود اس قافلے میں شامل ہیں۔

قیمت : چار روپے

مکتبۂ شاہکار

کلفٹن کالونی۔ پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

سرورق : ایشین آرٹ پریس، ۱۲۔ میکلوڈ روڈ، لاہور